ترامیم واضافہ شدہ ایڈیشن

پاکستانی ادب کے معمار

احمد فراز: شخصیت اور فن

محبوب ظفر

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

احمد فراز: شخصیت اور فن

(ترامیم واضافہ شدہ ایڈیشن)

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

پاکستانی ادب کے معمار

احمد فراز: شخصیت اور فن

محبوب ظفر

اکادمی ادبیات پاکستان

کتاب کے جملہ حقوق بحق اکادمی محفوظ ہیں

اس کتاب کے متن کا کوئی بھی حصہ نقل یا استعمال نہیں کیا جاسکتا، سوائے حوالے کے۔
خلاف ورزی پر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا استحقاق رکھتا ہے۔

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	ڈاکٹر راشد حمید
نگران منصوبہ وطباعت	:	علی یاسر
مصنف	:	محبوب ظفر
نظر ثانی	:	طارق نعیم
ٹائٹل	:	سجاد احمد
اشاعت (اول)	:	2006ء
اشاعت (دوم)	:	2016ء
تعداد	:	1000
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نست پریس، اسلام آباد
قیمت (مجلد)	:	-/580 روپے
(غیر مجلد)	:	-/560 روپے

ISBN: **978-969-472-220-7**

فہرست

پیش نامہ	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو	۷
پیش لفظ	محبوب ظفر	۹
خاندانی پس منظر		۱۱
احمد فراز: سوانحی خاکہ		۱۵
احمد فراز: بطور انسان		۱۹
احمد فراز کی کتابیں: مختصر جائزہ		۲۵
احمد فراز کی غزل		۵۷
احمد فراز کی نظم		۷۵
احمد فراز کے ڈرامے		۱۰۲
احمد فراز کے تراجم		۱۱۸
احمد فراز کی مزاحمتی شاعری		۱۲۶
احمد فراز اور جذبۂ حب الوطنی		۱۳۳
فراز کی شاعری میں عقیدتی حوالے		۱۵۰
احمد فراز: ''میں کیوں لکھتا ہوں''		۱۵۷
معاصرین کی آرا		۱۶۳
احمد فراز کی شگفتہ بیانی		۱۷۳
احمد فراز کا پاکستان اور پاکستان سے باہر آخری مشاعرہ		۱۸۱

احمد فراز کے منتخب اشعار	۱۸۵
انتخابِ غزل	۲۱۱
انتخابِ نظم	۲۳۹
منظوم خراجِ عقیدت	۲۹۹
کتابیات	۳۲۴

☆☆☆☆

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

احمد فراز اردو غزل اور نظم کے ایک ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ انھوں نے مقبولیت کی وہ منزلیں طے کیں جو ان کے معاصرین میں شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہوں۔ جہانِ اردو کے خالص ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ عوامی حلقوں میں بھی احمد فراز کی مقبولیت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہے۔ بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا شعری منظر نامہ آنے والے زمانوں میں بھی احمد فراز کے بغیر نامکمل تصور کیا جائے گا۔

احمد فراز پاکستان میں ترقی پسند فکر اور خرد افروزی کے نظریات کے ساتھ منسلک اہلِ قلم کے اس گروہ میں شمار ہوتے ہیں، جس کی تخلیقات حسن و خیر کے فروغ اور مجبور و مظلوم طبقوں کی حمایت کے آفاقی رویّوں سے عبارت ہیں۔ اس حوالے سے احمد فراز کا امتیاز یہ ہے کہ مزاحمتی رویّوں کے ساتھ ساتھ اردو کی عشقیہ شاعری کی عظیم کلاسیکی روایت کے ساتھ بھی نہ صرف جڑے رہے ہیں بل کہ اس کی ثروت میں گراں قدر اضافہ بھی کیا ہے۔

برادرم محبوب ظفر ہمارے ادبی حلقوں میں معروف شاعر، محقق، مترجم اور ایک ادب

دوست شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ محبوب ظفر نے ''احمد فراز: شخصیت اور فن'' لکھ کر یقیناً بڑی اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب احمد فراز کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

پیش لفظ

جب مجھے افتخار عارف صاحب نے جناب احمد فراز کی شخصیت اور فن پر کتاب مرتب کرنے کا حکم دیا اور یہ بتایا کہ میرا نام خود احمد فراز صاحب نے تجویز کیا ہے تو مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہوا۔ میرے لیے یہ ایسا اعزاز ہے جس پر بلا شبہ افتخار کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ احمد فراز ہمارے عہد کا بہت بڑا اور معتبر نام ہے۔ اردو شاعری اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اُسے احمد فراز ایسا شاعر نصیب ہوا۔ جب احمد فراز کی شاعری کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا جائے گا تو محسوس ہوگا کہ ہماری تاریخ زندہ لفظوں میں بول رہی ہے۔ کوئی لہجہ کوئی قدر اور کوئی حقیقت وقت کی گرد میں دفن ہو کر فنا نہیں ہوگئی بل کہ ایک ابدی زندگی کے خواب کی طرح اُن کے اشعار میں آنکھیں کھولے ہوئے ہے اور فراز ان کو نئے لفظ، جسد اور نئے روپ میں آباد کرتے جا رہے ہیں اور اپنے عہد کو آنکھ دے رہے ہیں۔ ان کی شاعری شیوۂ ہزار رنگ ہے۔

سچ یہ ہے کہ احمد فراز کا نام زبان پر آتے ہی دل میں عقیدت و احترام کے ہزاروں جذبات کا اک ایسا تلاطم پیدا ہوتا ہے اور ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است'' کی وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک لمحے کے لیے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کی بوقلمونی کے کسی پہلو کو حلقۂ تحریر میں لایا جائے، کس موضوع پر لکھا جائے اور کس کو نظر انداز کیا جائے، کس خوبی کو چھیڑا جائے اور کسے چھوڑا جائے کہ یہاں تو کمالاتِ فکر و فن کا وہ چمنستان کھلا ہوا ہے جس کو حرف و لفظ کی گرفت میں لانا قطرے کو سمندر میں سمونے کی ایک سعیِ لا حاصل کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جب تک اس کائنات میں زندگی کی دھڑکنیں کروٹیں لیتی

رہیں گی اس وقت تک احمد فراز پر لکھنے اور ان کے شعری و فکری جمال کی گرہیں کھولنے کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

احمد فراز شخصیت اور فن کا پہلا ایڈیشن 2006 میں فراز صاحب کی زندگی میں اشاعت پذیر ہوا تھا جو 2008 ہی میں ختم ہو گیا۔ تب سے اب تک فراز صاحب سے محبت کرنے والوں، ان کے فن پر کام کرنے والوں اور اہل علم کی مسلسل خواہش کے باوجود اس کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی تاہم اکادمی ادبیات کے موجودہ چیئرمین اور ملک کی ممتاز علمی و ادبی شخصیت جناب ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو کی ذاتی دلچسپی، فراز صاحب اور مشاہیر سے ان کی محبت کے سبب اب یہ کتاب کچھ ترامیم اور اضافوں کے ساتھ قارئین کی نذر ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ فراز صاحب ایسے عہد ساز شاعر کے حوالے سے جیسا مفصّل اور جامع اس کتاب کو ہونا چاہیے تھا یہ ویسی نہیں ہے۔ یہ ایک تعارفی اور ان کے فن کے حوالے سے ابتدائی نوعیت کی تحریر ہے جو شاید فراز صاحب سے محبت کرنے والوں اور ادب کے طالب علموں کو ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں کچھ جاننے میں مددگار ثابت ہو گی۔

میری یہ مختصر سی کاوش احمد فراز کے لیے نہیں خود میرے لیے شرف و افتخار کا باعث ہے۔

محبوب ظفر

خاندانی پس منظر

خزاں کے دن تھے اور درختوں نے اپنے پتے اُتار کر آوارگانِ کوچہ ودشت کے سپرد کر دیے تھے۔ ٹھٹھرتی راتوں کے سناٹے میں جب کسی پتے کی پازیب بجتی تو سارے ماحول میں ایک جلترنگ بج اُٹھتا۔ پتوں کی انہی مٹتی ٹوٹتی آوازوں میں جب بہار کا دور دور تک کوئی امکان نہ تھا ایک خوش بہار جھونکے نے اپنی آمد سے سب کو چونکا دیا۔

نوشہرہ کے ایک گھر میں ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو آنے والا یہ موجۂ بہار پہلے سیّد احمد شاہ اور بعد میں احمد فراز کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ کی زندگی کے ابتدائی دن پشاور کے ایک کوچے ''چڑی ماراں'' میں گزرے۔ بعد میں وہ کوہاٹ منتقل ہو گئے اور اسلامیہ ہائی سکول کوہاٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایڈورڈز کالج پشاور اور پشاور یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے۔ جہاں سے انہوں نے اُردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

آپ کا تعلق کوہاٹ کے ایک سیّد گھرانے سے ہے۔ آپ کے پردادا کا مزار کوہاٹ شہر کے وسط میں آج بھی خاص وعام کی زیارت گاہ ہے اور اُس سے ملحقہ ان کے آبائی قبرستان میں صرف آپ کے گھرانے کے لوگ مدفون ہیں۔

بچپن سے ہی آپ کو خاکسار تحریک کے نعروں اور ولولوں کی گونج سنائی دی جس نے آپ میں ایک مجاہدانہ جذبہ بیدار کر دیا۔ احمد شاہ جب خاکی وردی پہنے نوعمر بیلچہ برداروں کو پشاور کی سڑکوں پر پریڈ کرتے دیکھتا تو اُس کا جذبۂ جاں سپاری عود کر آتا۔ خوش آواز اور خوش چہرہ تو وہ تھا ہی اس کیفیت نے اُسے خوش اندام بھی بنا دیا۔ مارشل آرٹ سے زندگی کا آغاز کرنے والے اس نوجوان کو بھرپور ادبی ماحول ملا۔

بقول رضا ہمدانی:

> ''سیّد احمد شاہ نے جس ماحول میں زندگی کا آغاز کیا وہ ادبی ماحول تھا۔ ادھر اُدھر شاعری کے چرچے تھے۔ پھر جس گھر میں اس نے جنم لیا اور پرورش پائی وہ بھی

شعری نعمت سے خالی نہ تھا۔اس کے والد آغا محمد شاہ برق فارسی کے ساتھ ساتھ
اُردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ پشاور کی قدیمی ادبی انجمن ’بزم سخن‘ پشاور کے
سیکرٹری بھی تھے۔حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی کے ہونہار تلامذہ میں شمار
ہوتے تھے۔’پیش ماہ بنشیں کہ ماہ شوی‘ کے مصداق احمد شاہ بھی اس چاندنی
میں کھو گئے اور جب اس چاند کی کرنوں نے اسے گدگدایا تو وہ احمد شاہ سے گوہر
اور پھر شرر برقی بن گیا۔

پشاور میں مشاعرے بڑے تواتر کے ساتھ ہوتے۔طرحی مصرعوں پر شعرا کا ایک
ہجوم شعر گوئی کرتا۔اس ہجوم میں یکایک ’’شرر برقی‘‘ کا اضافہ ہو گیا۔ان دنوں شرر
برقی اپنی غزلیں ایک نوٹ بک میں لکھ لیا کرتا تھا۔یہ پاکٹ بک (بیاض) مقفل
ہوتی تھی۔وہ فرمائش پر غزل سنانے کے لیے جیب سے ننھی سی چابی نکال کر مقفل
بیاض کا تالا کھولتا اور غزل سرائی کرتا۔وہ خود بھی تازہ دم تھا۔اس لیے اس کی تازہ اور
کمسن غزل بھی تازہ فکر لیے ہوتی اور پھر وہ اپنے والد برق کی رعایت سے شرر برقی
کے نام سے سامنے آتا رہا۔شرر برقی سے پہلی غزل اسی مقفل بیاض سے میں نے
کوہاٹ کے ایک مشاعرے میں سنی تھی۔یہ مشاعرہ ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس مرحوم کی
صدارت میں ہوا تھا۔یہ اس کی سعادت مندی تھی کہ اس نے غزل پڑھنے سے
پہلے میرے ساتھ مشورہ بھی کیا تھا۔پشاور میں تازہ اور نو وارد غزل سراؤں میں شرر
برقی کا اپنے ہم عصروں میں خاصا چرچا تھا اور پھر اس کا ادبی قد آہستہ آہستہ نکلنا
شروع ہوا۔شعور پختہ ہوتا گیا یہاں تک کہ شرر برقی نے اپنی کرنوں کی فراوانی سے
اپنے عہد کے سینئر شعرا اور اساتذہ کو بھی چونکا دیا۔‘‘(۱)

محسن احسان بتاتے ہیں کہ پشاور کے اسی مشاعرے میں یہی نوجوان ایک کمبل میں دبکا بیٹھا
تھا۔میں جب مشاعرے میں آیا تو ایک طرف بیٹھ گیا یہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا اور پھر اشارے سے کہا کہ تم
بھی اس کمبل میں آ جاؤ اور آج تک ہم دوستی کے اسی کمبل میں لپٹے چلے آ رہے ہیں کچھ اس طرح کہ ہم تو
کمبل کو چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن کمبل ہمیں نہیں چھوڑتا۔‘‘

انھی دنوں صوبہ سرحد میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی جس کا مرکزی دفتر پشاور میں
بنایا گیا اور اس کے سیکرٹری جنرل فارغ بخاری تھے۔جبکہ پشاور شاخ کا سیکرٹری احمد فراز کو بنایا گیا جو،

اب شر ر برقی نہیں رہا تھا اور پھر اسی احمد فراز نے دنیائے شعروادب میں وہ مقام پیدا کیا کہ دنیا بہت زمانوں تک یاد کرتی رہے گی۔ عام طور پر یہ کہنا تقریباً سب شاعروں کے لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جنہوں نے انہیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ احمد فراز اس بارے میں کیا کہتے ہیں یہ انہی کی زبانی سنیے:

''میرے والد شعر کہتے تھے اور وہ اُردو اور فارسی کے عالم بھی تھے۔ زیادہ تر اُردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ان کی کتاب ''فروغِ جاوداں'' کے نام سے دستیاب ہے۔ لیکن اس سے زیادہ جس چیز نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا وہ سبب میری ایک ہم جماعت لڑکی نے مجھے بیت بازی کی دعوت دے کر فراہم کیا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن اس نے مجھ سے دریافت کیا ''تمہیں بیت بازی آتی ہے'' میں نے کہا وہ کیا ہوتی ہے جواب میں اُس نے مجھے بتایا کہ میں شعر پڑھوں گی جس لفظ پر وہ شعر ختم ہو گا آپ شعر پڑھیں گے پھر میں پڑھوں گی اور پھر ہار جیت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ یہاں سے شعر یاد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا مگر تادیر جاری نہ رہ سکا۔ کیوں کہ اس لڑکی کے شعری ذخیرے کے مقابلے میں میرا ذخیرہ نہ ہونے کے برابر تھا چنانچہ ایک دن سوچا کیوں نہ شعر خود ہی تیار کیا جائے۔ شعر بنانے کا معاملہ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا کہ ایک دن والد صاحب سیل سے کپڑا خرید کر لائے۔ میرے بڑے بھائی جو اس وقت ایف اے کے طالب علم تھے ان کے لیے سوٹ اور میرے لیے کشمیرا چیک لے آئے گو آج کل میں اس کا بڑا شوقین ہوں مگر اس وقت مجھے وہ کمبل کی مانند لگا اور میں نے اپنے جذبات کی ترجمانی میں ایک شعر بنایا اور کاغذ پر لکھ کر اس کپڑے کے ساتھ والد صاحب کے سرہانے رکھ دیا:

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

گو کہ فنی لحاظ سے یہ شعر اتنی اہمیت کا حامل نہیں تھا مگر طبقاتی ناہمواری کے بارے میں میرے اختلافی جذبات کا ترجمان ضرور تھا جو کہ میں نے احتجاج کے طور پر کہا تھا۔ میری بعد کی احتجاجی شاعری کی بنیاد آپ اسی شعر کو کہہ سکتے ہیں۔

میرے والد صاحب بہت خوش ہوئے اور ہنسے بھی اور فوری طور پر بازار جا کر
میرے لیے مختلف قسم کے کپڑے خرید لائے۔اس سے مجھے شاعری کی تاثیر کا
احساس ہوااور یہ بھی علم ہوا کہ شاعری احتجاج کا موثر ترین ذریعہ ہے۔''(۲)

فارغ بخاری کے مکان کی بیٹھک ان دنوں کافی مشہور ہوئی۔یہ محلّہ شاہ ولی قتال قصہ خوانی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک معروف محلے خداداد میں واقع تھی۔تاریخی اہمیت کی حامل یہ بیٹھک کم وبیش پچیس برس تک شعروادب کا مرکز بنی رہی۔احمد فراز کی تربیت اور تہذیب بھی اسی بیٹھک میں ہوئی یہیں سے اُنہوں نے شاعری کے اسرار ورموز سیکھے۔

انہی دنوں جب ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری پشاور کے دورے پر آئے تو ایک محفل میں آغا برق کوہاٹی کے حوالے سے احمد فراز کا ان سے تعارف کرایا گیا۔بس پھر کیا تھا اپنی طلسماتی شخصیت اور جملوں کی دلکشی کے سبب احمد فراز نے زیڈ اے بخاری کے دل میں گھر کر لیا۔ بخاری صاحب کی دعوت پر ہی وہ پشاور چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔جہاں انہیں ریڈیو پاکستان کراچی میں بطور پروڈیوسر تعینات کیا گیا۔آپ کی اضطراری طبیعت نے یہاں بھی چین سے نہ رہنے دیا تو آپ 1961ء میں پشاور یونیورسٹی میں لیکچرر بھرتی ہو گئے جہاں 1971 تک پڑھاتے رہے۔ 1971 میں وزارتِ اطلاعات ونشریات کے ایک ذیلی ادارے پاکستان نیشنل سینٹر میں بطور ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ 1976 تک اس عہدے پر کام کرنے کے بعد اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنا دیے گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد 1989 میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین بنا دیے گئے۔ 1991 سے 1993 تک لوک ورثا اسلام آباد کے چیف ایگزیکٹو رہے۔ 1994 میں آپ کو نیشنل بک فاؤنڈیشن کا مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا جہاں سے آپ 2005 میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔

آپ کی شاعری کے اب تک چودہ مجموعے منظرِ عام پر آکر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔اُن کے اب تک کتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ خود اُنہیں بھی معلوم نہیں تھا۔آپ کی تمام شاعری پر مشتمل کلیات ''شہرِ سخن آراستہ ہے'' کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔آپ کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔دنیا کا شاید ہی ایسا کوئی ملک ہو جہاں اردو نہ سمجھی جاتی ہو اور وہاں فراز کا کوئی مداح نہ ہو۔اردوادب وشعر کو اپنی شعاعوں سے منور کرنے والا یہ آفتاب اب ہم میں نہیں مگر اس کا لکھا ہوا لفظ ہمیشہ باقی رہے گا۔

احمد فراز: سوانحی خاکہ

اصل نام : سیّد احمد شاہ

قلمی نام : احمد فراز

والد : سیّد محمد شاہ برق

والدہ : سیّدہ امیر جان

بھائی بہن : سیّد محمود شاہ (بڑے بھائی مرحوم)

افتخار ناہید (چھوٹی بہن)

سیّد حامد شاہ (چھوٹے بھائی مرحوم)

سیّد مسعود کوثر۔ بار ایٹ لا (چھوٹے بھائی)

اولاد : تین بیٹے (سعدی فراز، شبلی فراز اور سرمد فراز)

پیدائش : ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء

تعلیم : ایم۔ اے (اُردو) ایم اے (فارسی)

درسگاہیں : اسلامیہ ہائی سکول کوہاٹ، ایڈورڈز کالج پشاور، پشاور یونیورسٹی، پشاور

شعری زندگی کا آغاز: سکول کے زمانے میں نویں دسویں سے ہوا۔

پہلا شعر

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

پہلی غزل :

رُک جایئے کہ رات بڑی مختصر سی ہے
سن لیجیے کہ رات بڑی مختصر سی ہے!

پہلی نظم : انتباہ

پسندیدہ غزل:

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

پسندیدہ نظم : واپسی

ادارت : داستان، خادم اور اشتیاق

تصانیف :	تنہا تنہا	1958	پاکستان
	دردِ آشوب	1966	ایضاً
	نایافت	1970	ایضاً
	شب خون	1971	ایضاً
	میرے خواب ریزہ ریزہ	1972	ایضاً
	جاناں جاناں	1976	ایضاً
	بے آواز گلی کوچوں میں	1982	لندن
	نابینا شہر میں آئینہ	1984	کینیڈا
	سب آوازیں میری ہیں	1985	سویڈن
	پس انداز موسم	1989	پاکستان
	بودلک (ڈرامہ منظوم)	1994	ایضاً
	خواب گل پریشاں ہے	1994	ایضاً
	غزل بہانہ کروں	1999	ایضاً
	شہرِ سخن آراستہ ہے (کلیات)	2004	ایضاً
	اے عشقِ جنوں پیشہ	2007	ایضاً
قومی ایوارڈ:	آدم جی ادبی ایوارڈ	1966	ایضاً
	اباسین ایوارڈ برائے ادب	1970	ایضاً
	دھنک ایوارڈ	1971	پاکستان
	ڈاکٹر محمد اقبالؒ ایوارڈ (اکادمی ادبیات پاکستان)	1990	ایضاً
	نقوش ایوارڈ برائے ادب	1992-93	ایضاً
	ستارۂ امتیاز برائے ادب	1994	ایضاً

	کمالِ فن ایوارڈ		
	(اکادمی ادبیات پاکستان)	2000	ایضاً
	ہلال امتیاز برائے ادب	2004	ایضاً
بین الاقوامی ایوارڈز:	فراق انٹرنیشنل ایوارڈ	1982	انڈیا
	بین الاقوامی ایوارڈ برائے		
	زبان و ادب ٹورنٹو اکادمی ادبیات	1991	کینیڈا
	جے این ٹاٹا ایوارڈ جمشید نگر		
	برائے امن اور انسانی حقوق	1992	انڈیا
	2000 ملینیم میڈل آف		
	آنرز یو۔ایس۔اے	1999	یو ایس اے
	پہلا کیفی اعظمی ایوارڈ	2002	یو اے ای
	ای ٹی وی کمالِ فن ایوارڈ	2004	انڈیا

تراجم: فراز کی شاعری کے تراجم۔انگریزی،فرانسیسی،ہندی،یوگوسلاوی، سویڈش،روسی،جرمن اور پنجابی میں ہو چکے ہیں۔

سرکاری خدمات:	لیکچرر۔پشاور یونیورسٹی	1961-1971
	ڈائریکٹر۔پاکستان نیشنل سینٹر	1971-1976
	ڈائریکٹر جنرل۔پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز	1976-78
	چیئرمین۔ ایضاً	1989-90
	چیف ایگزیکٹو۔لوک ورثہ	1991-93
	مینیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن	1994-2005

ریکارڈنگ: اثاثہ (وڈیو کیسٹ) دوبئی
محاصرہ (لانگ پلے) لندن
یہ میری نظمیں یہ میری غزلیں (ای ایم آئی) پاکستان
شاہکار غزلیں (کیسٹ) واشنگٹن امریکہ

سیمینار فنکشن: اندرونِ ملک اور بیرون ملک دنیا کے تمام اہم ممالک میں منعقدہ ادبی سیمینارز اور فنکشنز میں شرکت کر چکے ہیں۔

نصاب میں: علی گڑھ یونیورسٹی۔(انڈیا)

پشاور یونیورسٹی (پاکستان)

پی۔ایچ۔ڈی مقالے: احمد فراز کی غزل، جامعہ ملیہ یونیورسٹی (انڈیا)

احمد فراز فن اور شخصیت اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور (پاکستان)

ڈاکٹریٹ کی ڈگری: آپ کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں یونیورسٹی آف کراچی نے 15-2-1995 کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

فیلوشپ: آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اکادمی ادبیات پاکستان نے آپ کو آنریری لائف فیلوشپ عطا کی۔

فراز کارنر: 2003 میں سینٹرل لائبریری واہ کینٹ میں احمد فراز کارنر کا افتتاح ہوا۔

احمد فراز لائبریری: 2009 میں اکادمی ادبیات پاکستان کی لائبریری کا نام "احمد فراز لائبریری" رکھا گیا۔ جہاں فراز صاحب اکادمی کے پہلے پراجیکٹ ڈائریکٹر اور بعدازاں چیئرمین بھی رہے۔

احمد فراز چوک: 2012 میں پشاور کے ایک انتہائی اہم چوک جو قلعہ بالاحصار کے قریب ہے، اُس کا نام احمد فراز چوک رکھا گیا۔

احمد فراز آڈیٹوریم: 2014 میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے آڈیٹوریم کا نام "احمد فراز آڈیٹوریم" رکھا گیا جہاں احمد فراز 11 سال تک مینجنگ ڈائریکٹر رہے۔

احمد فراز روڈ: 2009 میں اسلام آباد کی ایک اہم شاہراہ کو احمد فراز کے نام سے منسوب کیا گیا۔

پسندیدہ رنگ: نیلا

سٹار: کیپری کارن

سگریٹ: ڈن ہل

شخصیات: فیض، احمد ندیم قاسمی، ہوچی من، نیلسن منڈیلا

گلوکار: نورجہاں، امانت علی خان، مہناز، فریدہ خانم، طاہرہ سیّد، سلمیٰ آغا

شعر (کوئی)

اِک سخن اور کہ پھر طرزِ تکلم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

پسندیدہ شاعر: غالب

احمد فراز: بطور انسان

کسی بھی شخص کی بڑائی کا اندازہ اس کے حاسدین کی تعداد سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ وہ کام کر نہیں پاتے یا ان میں وہ کام کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے جو وہ شخص کر رہا ہوتا ہے تو پھر وہی لوگ اس سے حسد کرنے لگ جاتے ہیں۔ احمد فراز ایک شاعر بھی تھے اور شاعر بھی ایسے کے اپنے نام کی نسبت سے وہ اتنی بلندی پر تھے کہ بہت سے دوسرے شاعروں کو انہیں ایڑیوں پر کھڑے ہو کر دیکھنا پڑتا تھا اس عمل میں بعض اوقات کئی لوگوں کی دستاریں گرنے کا اندیشہ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی بھی شخص کا قد و قامت جاننے کے لیے اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یا سفر کرنا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ہم نے اکثر مشاہدہ کیں کہ احمد فراز سفر میں ہوں یا دوستوں کی محفل میں ان کے اخلاص میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک کھرے انسان تھے اور شاید ان کی طبیعت کا یہ کھرا پن بعض لوگوں کو کھٹکتا تھا کیوں کہ وہ بات ہمیشہ سامنے کہہ دیتے تھے اور یہاں تک کہ اگر ان کے ذہن میں سامنے والی شخصیت کے بارے میں کوئی مزاح کی بات آجاتی تو وہ بھی برملا کہہ دیتے اور یہ پروا ہرگز نہ کرتے کہ سامنے والا وہ بات سننے کی تاب بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ بنیادی طور پر وہ مزاحمتی آدمی تھے کسی پر ظلم ہوتا ہرگز نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جب عدلیہ بحالی کی تحریک چلی تو وہ واحد شاعر تھے جنہوں نے کچھ دوسرے اہل قلم کو ساتھ لے کر حکومت کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اسی طرح مزاحمت پر ضیاءالحق کے زمانے میں انہیں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا انہیں جیل میں بھی رکھا گیا اور پھر انہیں ملک بدر ہونا پڑا مگر وہ اپنے موقف سے کبھی نہ ہٹے۔ نظم ''محاصرہ'' جو انہوں نے اس دور میں لکھی تھی وہ ہمیشہ اسے اون کرتے اور جابر آمروں کے زمانوں میں بھی مشاعروں میں پڑھتے اور لوگ بھی ان کا ساتھ دیتے۔ بلاشبہ وہ ہمیشہ شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر رہے۔ شاید اسی لیے ان کے حاسدوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی رہی ان کے زیادہ تر حاسد وہ تھے جو ان بلندیوں کو نہ چھو سکے۔ پھر ان حاسدوں نے ان پر کئی قسم کے الزامات لگانے شروع کر دیے ایک الزام یہ لگایا کہ وہ ٹین ایجز کا شاعر ہے، اس طرح کے الزامات لگانے والے شاید اندر سے اب تک ان سے خوفزدہ ہیں، یہ کہتے ہوئے ان کی نظموں اور غزلوں کو دھیان میں نہ لایا گیا جو مزاحمتی حوالے سے

اس وقت کی بڑی نظمیں تھیں اور آج بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔فراز نے اپنی ان نظموں اور غزلوں میں بھی جابر سلطان کے آگے ہمیشہ حق بات کہنے اور کسی جبر سے خوف نہ کھانے کی بات کی ہے۔ٹین ایجر کا شاعر ہونے اور خواتین کے حوالے سے تعلقات کا الزام ہمیشہ ان پر لگایا جاتا رہا۔یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ ایک وجیہہ شخصیت کے مالک تھے پھر یہ کہ ان کی شاعری میں ایک جادو تھا، بہت سے لوگ ان کے پرستار تھے جن میں خواتین بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔مگر جہاں تک میرا مشاہدہ ہے ان کی شخصیت میں ایک وقار تھا، سنجیدگی تھی وہ کبھی کسی خاتون کے پیچھے نہیں جاتے تھے اور اگر کہیں ہوتا بھی تو اس میں بھی ایک پردہ داری، سلیقہ اور پورے ادب و آداب ہوتے۔اپنے تعلق پر اترانا اور اس کا چرچا کرنا ان کا شیوہ نہیں تھا۔سب سے بڑی بات کہ وہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائیاں نہیں کرتے تھے۔خاص طور پر خواتین کے معاملے میں تو وہ عزت و احترام کا جذبہ رکھتے تھے۔بہت سی خواتین ان سے ناراض ہو کر جا رہی ہوتیں تو وہ انہیں مسکراتے ہوئے رخصت کرتے اور کچھ عرصے بعد وہ خود ہی ملنے آجاتیں تو پھر بھی اسی مسکراہٹ سے ملتے کوئی شکوہ نہ شکایت۔ورنہ بہت سارے ایسے شاعر بھی تھے جو اپنے تعلق کے جڑنے اور ٹوٹنے کا اتنا چرچا کرتے تھے کہ بات بی بی سی تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

فرازؔ صاحب کتابوں پر فلیپ بہت کم لکھتے تھے، ایک بار یہاں کی ایک شاعرہ فراز صاحب کو اپنی شاعری کی کتاب کا مسودہ دے گئیں کہ اس پر کچھ لکھ دیں۔فرازؔ صاحب کے انکار پر بھی وہ نہیں مانیں اور مسودہ رکھ کر چلی گئیں مگر فرازؔ صاحب نے ان کی کتاب پر رائے نہیں دی۔اسی طرح ایک مشہور خاتون شاعرہ لاہور سے تین دن لگاتار اسلام آباد ہوٹل ان سے فلیپ لکھوانے کے لیے آتی رہیں مگر فراز صاحب نے فلیپ لکھ کر نہیں دیا۔ایک زمانے میں مولانا کوثر نیازی کی وزارت میں ان کے ماتحت کام کرتے ہوئے ان کے شعری مجموعے کا دیباچہ لکھنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس کے شاعرانہ معیار پر انہیں تحفظات ہیں۔مجھے یاد ہے کہ ایک بار کسی سکول میں کوئی تقریب تھی جس میں اوّل آنے پر ایک پانچویں کلاس کی بچی کو انعام دیا جانا تھا۔بچی کے والدین نے فراز صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس تقریب میں ضرور آئیں، اس طرح بچی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔فراز صاحب طبیعت کی ناسازی کے سبب اس تقریب میں نہ جا سکے۔کچھ دن بعد اپنے پی ایس سے بچی کے گھر کا ایڈریس معلوم کرنے کا کہا مقررہ وقت پر وہ بچی کے گھر گئے، اس کو پیار کیا اور کیک کے ساتھ پانچ ہزار روپے بھی انعام کے طور پر پیش کیے۔اس طرح کے کام وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔جب کبھی کہیں کسی کے گھر کھانے پر جاتے تو وہاں کے بیروں کو ضرور کچھ رقم دیتے۔ایک بار لاہور میں تین روزہ ورکشاپ کے سلسلے میں فراز صاحب آواری ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔رات کو وہاں ڈنر رکھا گیا تو ہم لوگ بھی اس میں مدعو کیے گئے تھے۔ہم جا رہے تھے تو باہر ہی ہوٹل کا ایک گلوکار فراز صاحب کی غزل گا رہا تھا۔اس کی آواز اتنی اچھی

نہیں تھی، بس اپنی ڈیوٹی نبھا رہا تھا فراز صاحب نے سنا تو ناراض ہوئے کہ یار یہ کتنی بری آواز میں گا رہا ہے مگر پھر بھی اس کے پاس گئے اسے تھپکی دی اور دو ہزار روپے اس کی خدمت میں پیش کیے۔ اس سے اور تو کچھ نہیں ہوا اس کی آواز میں قدرے بہتری آ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک صحافی جوان کے ارادت مندوں میں بھی شامل تھا ایک بار ان کے پاس آیا اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ اس کے مکان کی چھت گر گئی ہے تو فراز صاحب نے اسے بغیر کسی شرط کے آٹھ لاکھ روپے کا چیک دیا اور دوستوں کو منع کر دیا کہ کوئی اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے تاکہ غریب صحافی کی خودداری مجروح نہ ہو۔

ایک دوست کے بیٹے سے وہ اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے اس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو فراز صاحب نے اسے 25 لاکھ روپے کا چیک دیا اور کہا کہ بیٹے کے لیے اس کی حسب خواہش تعلیم ضروری ہے۔ میری بیٹی کی شادی کا سنا تو مجھے خالی چیک دستخط کر کے دے دیا کہ جتنی رقم کی ضرورت ہو نکلوا لو تاکہ بیٹی کی شادی کے معاملے میں کوئی دشواری نہ آئے۔ وہ کئی بیواؤں اور ضرورت مندوں کی باقاعدہ امداد کرتے رہتے تھے ان کے ماہانہ خرچ بندھے تھے جو فراز صاحب کے اکاؤنٹ سے ماہانہ منہا ہوتے رہتے تھے۔

ایک بات اور کہ وہ مختلف علمی و ادبی اداروں کے سربراہ رہے مگر کرپشن کے حوالے سے ان پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا۔ اسلام آباد کے ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر نے ایک بار ان کے حوالے سے مالی بے قاعدگیوں کی خبر شائع کر دی وہ دراصل انہیں بلیک میل کرنا چاہتا تھا یہ جانے بغیر کہ وہ احمد فراز ہیں۔ فراز صاحب نے وزارت تعلیم کو خود ہی خط لکھا کہ معاملے کی تحقیق کرائی جائے اور جب تک انکوائری چلے گی تو میں دفتر میں کام نہیں کروں گا پھر وہ انکوائری ہوئی اور کچھ ثابت نہ ہوا۔ اس پر فراز صاحب نے اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کیا اور کچھ عرصے بعد عدالت نے اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف اڑھائی کروڑ روپے کی ڈگری جاری کر دی۔ وہ تو ایسا ہوا کہ فراز صاحب کچھ دن بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے ورنہ پتا نہیں اخبار والے کا کیا بنتا۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ وہ خواتین سے اپنے تعلقات کا کبھی چرچا نہیں کرتے تھے اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرتا چلوں کہ جب وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے تو سنگ میل پبلی کیشنز کے نیاز احمد نے انہیں فون کیا کہ فراز صاحب آپ اپنی آپ بیتی کیوں نہیں لکھتے اور خاص طور پر ان خواتین کا ذکر ضرور کریں جن سے آپ کا تعلق رہا ہے اس کے لیے میں آپ کو دس لاکھ روپے دوں گا۔ فراز صاحب مسکرائے اور جواب دیا کہ نیاز صاحب بیس لاکھ روپے تو وہ خواتین آپ بیتی نہ لکھنے کا دے رہی ہیں۔

احمد فراز جس ادارے میں بھی رہے ایک شاعرانہ انا اور خودداری قائم رکھی کسی زمانے میں نیشنل سینٹر میلوڈی میں ہوا کرتا تھا اور فراز صاحب اس کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر تھے۔ نیشنل سینٹر ز بھی بھٹو

صاحب کے زمانے میں بنائے گئے جن کے ذریعے مختلف تقاریب کرائی جاتیں اور حکومتی مثبت پالیسیوں کی تشہیر کا ذریعہ بھی تھے۔نیشنل سینٹر طارق چیمبر کے فرسٹ فلور پر ہوا کرتا تھا۔

ایک تقریب میں اس وقت کے وفاقی وزیر غلام دستگیر خان کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔ جب ان کی گاڑی آئی تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر عشرت معصوم دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ فراز صاحب منسٹر صاحب آ گئے ہیں ۔فراز صاحب نے کہا کہ پھر میں کیا کروں بھئی انہیں لے جا کر ہال میں بٹھاؤ اور جب تقریب شروع ہو تو مجھے بلا لینا۔اسی طرح ایک بار نیشنل بک فاؤنڈیشن میں تقریب تھی، ریڈرز کلب کا افتتاح ہونا تھا اس وقت کی وزیر تعلیم زبیدہ جلال مہمان خصوصی تھیں۔تقریب ختم ہو گئی اور وہ فراز صاحب کے دفتر میں چائے پی رہی تھیں۔اس تقریب میں پی ٹی وی والے کسی وجہ سے لیٹ ہو گئے اب وہ چاہتے تھے کہ فراز صاحب اور زبیدہ جلال دوبارہ سٹیج پر بیٹھیں اور وہ اسے شوٹ کر کے خبروں میں نشر کر سکیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ طارق نعیم اندر جا کر بات کریں جب کہ طارق کا خیال تھا کہ فراز صاحب نہیں مانیں گے نگران کے اصرار پر طارق نے فراز صاحب سے بات کی تو فراز صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح کا ڈراما مجھ سے نہیں ہو سکتا۔زبیدہ جلال نے کہا بھی کہ فراز صاحب چلے چلتے ہیں مگر فراز صاحب یہ ڈراما کرنے پر راضی نہ ہوئے اور زبیدہ جلال کو اکیلے ہی جا کر یہ فریضہ انجام دینا پڑا۔

یہ باتیں میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کر سکوں۔اصل بات یہ تھی کہ ان کے حاسدوں نے ایک دھند کی فضا قائم کی ہوئی تھی جس میں صرف یہی ظاہر کیا جاتا تھا کہ فراز صاحب اچھے آدمی نہیں ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ لوگوں نے ان کی شاعری کو تسلیم کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی یہ کہا جانے لگا کہ فراز شاعر تو اچھا ہے مگر آدمی ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ وہ سچے اور کھرے آدمی تھے۔منافقت نام کو نہیں تھی جس سے دوستی ہے اس سے دوستی ہے جس سے اختلاف ہے اس سے دوستی ہونا بہت مشکل تھا۔انہیں کسی نے کبھی کسی وزیر یا مشیر کی خوشامد کرتے نہیں دیکھا۔شاید لوگوں کا المیہ ہے کہ وہ کھرے آدمی کے ساتھ بمشکل ہی چل پاتے ہیں یا تو وہ راستہ چھوڑ دیتے ہیں یا پھر اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔وہ شیشے کی طرح بالکل صاف شخص تھے جس کے آر پار آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ہلکی سی ٹھیس سے ٹوٹ سکتے تھے مگر کسی سنگِ مقتدر کے آگے جھک نہیں سکتے تھے۔ان کے مزاج میں مصلحت تھی نہ مصالحت۔ وہ صرف اسی سے ہاتھ ملاتے جس کی انہیں دل اجازت دیتا تھا۔ایسے بے شمار واقعات کا میں عینی شاہد ہوں جس کی تفصیل یہاں نہیں لکھی جا سکتی۔جس سے ان کے کردار اور شخصیت کی عظمت اور ان کی رواداری، انسان دوستی، محبت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں پر ان کے یقینِ محکم کا پتا چلتا ہے۔

پاکستان سے محبت ان کے خون میں رچی بسی تھی۔ایک مرتبہ دہلی ٹی وی کے ایک پروگرام میں جس میں ایک وزیر بھی تھے۔فراز صاحب کشمیر پر بات کرتے ہوئے یوں اس وزیر سے سخت ترین

لہجے میں الجھ پڑے کہ وزیر موصوف کو جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ وہ اوّل و آخر ایک سچے اور کھرے پاکستانی تھے اور پاکستان اور پاکستانی عوام کے حقوق کی جنگ میں وہ تمام مصلحتیں اور خوش بیانیاں پس پشت ڈال دیتے تھے۔ البتہ ان کی شاعری میں یہ باتیں تخلیق اور تہذیب کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتی تھیں جس سے ان کے شعر دلوں میں اترتے چلے جاتے تھے۔

پاکستان سے ان کی لازوال محبت کا ایک واقعہ یاد پڑتا ہے۔ فراز صاحب کسی زمانے میں پان باقاعدگی سے کھایا کرتے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ پان مشرقی پاکستان سے وابستگی کی علامت ہے۔ 16 دسمبر 1971 کو جب مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا تو اسی دن سے انہوں نے پان کھانا چھوڑ دیا اور پھر عمر بھر پان کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پان سے میری وابستگی مشرقی پاکستان کے حوالے سے تھی اب جس دن کوئی مجھے پان کھاتا دیکھ لے وہ سمجھ لے کہ اب مجھے اپنے ملک سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

ایک بار نیشنل بک فاؤنڈیشن کے آٹھ کے قریب اہلکاروں نے حج کے لیے چھٹی کی درخواستیں دیں جن میں چار پانچ افسران بھی تھے۔ فراز صاحب نے چھٹی دینے سے انکار کر دیا ان کا موقف تھا کہ ایک تو ان لوگوں نے حج درخواستیں جمع کراتے وقت دفتر میں اطلاع نہیں دی، دوسرے اتنے سارے لوگوں کو ایک ساتھ چھٹی کیسے دی جا سکتی ہے۔ یہ خالصتاً مذہبی معاملہ بن گیا، ادھر ادھر سے سفارشیں آئیں مگر وہ نہیں مانے۔ ایک دن وزیر تعلیم زبیدہ جلال خود تشریف لائیں اور فراز صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان کی درخواستیں منظور کر لیں۔ فراز صاحب نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں دفتر بند کر دوں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ انہیں اجازت دی جانی چاہیے تو آپ اپنے دستخطوں سے اجازت دے دیں۔ پھر یہی ہوا کہ وزیر تعلیم ہی کو اس کی اجازت دینا پڑی۔

بڑا انسان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی پہچانا جاتا ہے اور یہ باتیں دراصل بڑی باتیں ہی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار میں اور طارق نعیم میلوڈی کی طرف سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر جا رہے تھے۔ فراز صاحب اپنی گاڑی میں وہاں سے گزرے تو انہوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا مگر گاڑی کیوں کہ کافی آگے جا چکی تھی اس لیے وہ اسے ریورس کر کے پیچھے لائے ہم سے خیریت پوچھی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم جہاں جانا چاہتے ہیں وہ ہمیں وہاں ڈراپ کر دیں گے۔ یہ چھوٹی سی بات دراصل بڑی بات تھی کیوں کہ وہ اس وقت شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر تھے اور ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ بھی رکھتے تھے۔

آخری بات یہ کہ کچھ انڈین فلم انڈسٹری کے لوگ ان سے فلم کے لیے لکھوانا چاہتے تھے مگر فراز صاحب مسلسل انکار کرتے رہتے تھے۔ ایک بار وہ وفد کی صورت میں پاکستان آئے اور فراز صاحب سے درخواست کی کہ فلم کے لیے کچھ لکھ دیں۔ فراز صاحب نے انہیں پھر بتایا کہ وہ ایسا نہیں کر

سکتے تو انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ''رنجش ہی سہی دل دکھانے کے لیے آ'' جیسی کوئی غزل لکھ دیں جو مہدی حسن نے گائی ہے تو فراز صاحب نے ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا چلو غزل تو میں لکھ دوں گا مگر آپ مہدی حسن کہاں سے لاؤ گے۔

شاعری کی طرح فراز صاحب کی گفتگو بھی پرکشش ہوتی تھی۔ وہ نہایت ذہین، حاضر جواب اور نہایت خوش گفتار انسان تھے۔ ان کے فقرے اور مکالمے سادگی و پرکاری سے مرصع ہوتے۔ اس لیے وہ جس محفل میں اور جہاں ہوتے شعر سنائے بغیر بھی مرکز توجہ بن جاتے تھے۔

کبھی فراز سے آ کر ملو جو وقت ملے
یہ شخص خوب ہے اشعار کے علاوہ بھی

میں ان خوش نصیب لوگوں میں ہوں جنہیں ان کی زندگی کے آخری دس برسوں میں خصوصیت کے ساتھ کم و بیش روزانہ ان سے ملاقات و محبت کا شرف حاصل رہا ہے۔ ایسے سادہ کمال آدمی کے رشک آتا ہے۔ موبائل صرف کال کرنے یا سننے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ شام کو ملاقات کے وقت میں انہیں دن بھر کے میسج پڑھ کر سناتا اور کبھی کبھی ان کی طرف سے جواب بھی دیا کرتا تھا۔ ایسے مرنجانِ مرنج وضعدار اور بے تکلف کے اب سوچیں تو آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔

فراز صاحب بظاہر ایک کھلنڈرے، بے پروا اور منہ پھٹ لگتے ہوں گے مگر یہ سب دوستوں کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ یہ ذرہ بکتر انہوں نے اس لیے بھی پہن رکھی تھی کہ دنیا کے ناپسندیدہ عناصر ان کے قریب نہ پھٹک سکیں۔ یہ ملامتی صوفیوں والا رویہ انہوں نے شروع ہی سے اپنا رکھا تھا مگر اس کے پیچھے ایک بے پناہ محبت کرنے والا دل ہمہ وقت دھڑکتا تھا اور جسے دوست اور دشمن کی پہچان بھی تھی۔

فراز صاحب نے اپنے شعری، فکری اور نظریاتی سفر میں کبھی فرار کی راہ اختیار نہیں کی۔ وہ آخر وقت تک متحرک رہے، کہیں ٹھہرے ہوئے نظر نہیں آئے ہر واقعے میں لکھنے والوں کی نمائندگی اکیلے احمد فراز نے کی۔ اسی طرح ابدی سفر پر روانہ ہوئے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا میں نے شفا انٹرنیشنل ہسپتال میں اس عظیم شاعر اور شخص کی زندگی کے آخری دن شبلی، سعدی، سرمد اور ان کی فیملی کے ساتھ لمحہ لمحہ گزارے ہیں۔ دنیا بھر سے ان سے محبت کرنے والوں کے فون، ان کے آنسو، ان کی محبتیں اور ملک سے باہر سے انہیں دیکھنے والوں کی آنکھیں، فراز صاحب سے لپٹ لپٹ کر رونے کے مناظر اور ایسے چہرے اور ان کے کپکپاتے لبوں پر فراز صاحب کے لیے اپنے مالک سے یوں دعائیں مانگتے دیکھا ہے کہ رشک آتا ہے۔

دیکھو یہ میرے خواب تھے، دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھ دیا

احمد فراز کی کتابیں: مختصر جائزہ

تنہا تنہا (ضیاء الدین ضیاء کے نام)

احمد فراز کی شاعری کا آغاز تو قیامِ پاکستان سے ذرا پہلے ہو چکا تھا۔ 1958ء میں اپنی پہلی کتاب ''تنہا تنہا'' کی اشاعت تک وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام بنا چکے تھے۔ بولتے ہوئے لہجے اور فنی تازگی کے ساتھ انہوں نے شعر و ادب میں وہ جگہ بنالی تھی جو بہت سارے شاعروں کو تمام عمر میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اُردو غزل میں غنائیت کی دیوار لحہ بہ لحہ گر رہی ہے۔ بہار میں خزاں اور خزاں میں بہار کے وسوسے سر اٹھانے لگے ہیں ہر شاخِ چمن جل رہی ہے۔ کوئی نوائے عندلیب حزیں سننے والا نہیں زندگی اپنے ہونے کا جواز ڈھونڈ رہی ہے۔ تقسیم کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ہجرت کے زخم ابھی ہرے ہیں بچھڑنے والوں کی یادیں سلگتے انگاروں کی طرح دامنِ دل کو سلگائے دیتی ہیں۔ ہر شے کی ترتیب بدل گئی ہے چیزیں اپنے ٹھکانے ڈھونڈ رہی ہیں۔ تشخص کی بحالی کے دن ہیں ایک نسل ختم ہو گئی ایک نسل تعمیر ہو رہی ہے۔ ہر شخص کے پاس گزرے دنوں کے کچھ اندوختے ہیں جن سے وہ اپنا آئندہ آباد کر رہا ہے۔ اسی زمانے میں احمد فراز اپنے شعر سے جذبوں اور اُمنگوں کی تازہ بستیاں آباد کرتے ہیں۔ ماضی اب قصوں میں رہ گیا ہے۔ نئے آقا اور نئے قصیدہ خواں ہیں۔ اسی شکست و ریخت میں احمد فراز کی پہلی کتاب ''تنہا تنہا'' آتی ہے جس کی نظم ''خیر مقدم'' دراصل درباری سیاست کا نوحہ ہے کیوں کہ اس زمانے تک دربار رچ چکا ہے اور گداگرانِ سخن سمیت دوسری وضع کے سارے گداگر دربار میں حاضری کے خواستگار ہیں ایسے میں فراز کی نظم دیکھیے:

خیر مقدم

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا
کہ پھر آج وہ ساعتِ جانستاں آ گئی ہے
جب اُن سے کوئی اُن کا آقا جدا ہو رہا ہے
وہ آقا؟

کہ جس کی مسلسل کرم گستری سے
کوئی خادمِ خاص ہو یا کہ ادنٰی ملازم
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا
وہ آقا کہ جس کی کشادہ دلی نے خزانے لٹائے
وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں
سے حاتم کے مفروضہ قصے بھلائے
اگر چہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کو بکو
بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا
مگر پھر بھی ہر سمت امن واماں تھا
اگر چہ جہانگیر کی طرح اُس نے
کوئی ایسی زنجیرِ زر قصرِ شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی
جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اٹھاتی
مگر پھر بھی ہر گھر میں عدل ومساوات کا سائباں تھا
اگر چہ کبھی وہ جھروکے میں بیٹھے
رعایا کو رُوئے مبارک کے درشن سے مجبورِ سجدہ نہ کرتا
مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا
وہ جانِ جہاں تھا بڑا مہرباں تھا
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ آخر وہ لمحات بھی آ گئے ہیں
جب اُن سے بچھڑنے کو ہے اُن کا دیرینہ آقا
تو وہ آج اُسے کون سا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش جس سے
رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو
اپنے وفادار و پاپوش بردار خادم
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں
قصرِ شاہی کے جارُوب کش سے بھی کہتر
مگر عالمِ کلک وقرطاس کے بادشہ ہیں

وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے
ذرّوں کو ہم رتبۂ مہر و مہتاب کر دیں
وہ چاہیں تو اپنے تخیل کے جادو سے
صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں
وہ چاہیں تو اپنے کمالِ بیاں سے
فقیروں کو اورنگ و افسر کا مالک بنا دیں
محلات کے بام و دیوار ڈھا دیں
وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں
کہ وہ عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے
محبوب آقا کی تعریف و توصیف میں
آسمان و زمیں کو ملائیں!
کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں
کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ تو ہیں عہدے میں ایوانِ شاہی
کے جاروب کش سے بھی کہتر
انہیں کیا کوئی آئے یا کوئی جائے
کہ اُن کا فریضہ تو ہے صرف
آقائے حاضر کی خدمت گزاری
کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش
تو پھر مصلحت ہے اسی میں
کہ اپنے قصیدوں سے آقائے نو کا کریں خیر مقدم!

یہ نظم اہلِ دربار میں تہلکہ مچا دیتی ہے ۔ بلند و بالا شاہی ایوانوں کے در و دیوار ہلا دیتی ہے اور ساتھ ہی خالص رومانی شدت لیے فراز کی غزل فضا کو دو آتشہ کر دیتی ہے ۔ پھر احمد فراز ان لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں جنھیں اپنی پہلی کتاب سے شرفِ قبولیت مل گیا تھا ۔

کچھ شعر تنہا تنہا سے :

تیری باتیں ہی سنانے آئے
لوگ بھی دل ہی دکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

اس مجموعے میں پینتالیس نظمیں اور بیالیس غزلیں شامل ہیں۔

دردآشوب (محبوب اختر کے نام)

دردآشوب 1966ء میں اشاعت پذیر ہوئی اور اُسی برس اس مجموعے کو آدم جی ادبی ایوارڈ دیا گیا۔ یہ زمانہ ملکی سیاست کے انحطاط کا زمانہ ہے۔ ایوب خان اپنا عرصۂ اقتدار طویل کر چکے ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح کو سیاست سے باہر کر دیا گیا ہے اور آمریت اطمینان سے ہے کہ اب علمِ احتجاج بلند کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ اسی زمانے میں فراز کی نظمیں فنکاروں کے نام، معبود، شاخِ نہالِ غم، خودکلامی، اظہار، خودکشی، شکستِ زیرلب، ہمدرد، خواب، سوال، غریبِ شہر کے نام، پیغام بر، خدائے برتر، خودغرض، وابستگی، ممدوح، اے نگارِ گل، گل شدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو، تریاق، مجھ سے پہلے، کوئی بھٹکتا بادل، زندگی اے زندگی۔ یہ تو جب ممکن ہے، پیمبرِ مشرق، المیہ، ملکیت، تمثیل، نیند، خوشبو کا سفر، اب کے برس بھی، میں اور تو اور افسر شاہی ادیبوں کے نام شائع ہوتی ہیں۔ لوگ احتجاج کا ایک نیا لہجہ دیکھتے ہیں۔ انہی دنوں ان کی اولِ عشق کے نشے والی کچھ غزلیں شائع ہوئی ہیں جو آگے چل کر بے پناہ مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔ ان کی دو غزلیں دیکھیے:

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تُو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

O

قربتوں میں بھی جُدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لُٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پُرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

O

جُز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تُو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

تُو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسس بے کار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تُو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سُناتے ہیں فسانے میرے

لُٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

.....ق.....

کاش تُو بھی مری آواز کہیں سنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تُو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے
کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری، آج خدا نے میرے

تُو ہے کس حال میں اے زُود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فرازؔ
جُز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

اس مجموعے میں پینتیس نظمیں اور چھیاسٹھ غزلیں شامل ہیں۔

نایافت

احمد فراز کا یہ تیسرا شعری مجموعہ اُس وقت منظرِ عام پر آیا جب ملک میں جمہوریت اپنا آغاز کر چکی تھی۔ہم دیکھتے ہیں کہ اس مجموعے میں نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔مترنم غزلیں کہنے والا شاعر اب زیادہ تر نظم کہہ رہا ہے۔وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ فقط شب و روز بدلے ہیں منظر نامہ نہیں بدلا۔اُسے اب بھی سچ کا زہر پیا پڑ رہا ہے۔دھند لکا ابھی چھٹا نہیں۔شاید وہ صبح بھی ابھی نہیں آئی ہم جس کا خواب لے کر چلے تھے۔امید و بیم کے اس مرحلے میں وہ ایک نظم کہتا ہے چلو اُس بُت کو بھی رولیں۔

چلو اُس بُت کو بھی رولیں
جسے سب نے کہا پتھر
مگر ہم نے خدا سمجھا
خدا سمجھا
کہ ہم نے پتھروں میں عمر کاٹی تھی
کہ ہم نے معبدوں کی خاک چاٹی تھی

کہ پتھر تو کہیں دیوارِ زنداں
اور کہیں دہلیزِ مقتل تھے
کبھی سرمایۂ دامانِ خلقت
اور کبھی بختِ جنوں کیشاں
کبھی ان کا ہدف دکانِ شیشہ گر
کبھی صورت گرِ ہنگامۂ طفلاں
کبھی بے نور آنکھوں کے نشاں
بے اشک بے ارماں
کبھی لوحِ مزارِ جاں
نہ چارہ گر نہ اہلِ درد کے درماں
مگر وہ بُت
چراغِ بزمِ تنہائی
مجسم رنگ و رعنائی

فضا کی روشنی
آنکھوں کی بینائی
سکونِ جاں
وہ آنکھیں درد کی جھیلیں
وہ لب چاہت کے شعلوں سے بھرے مرجاں
وہ دستِ انساں
مگر ہم نے وفورِ شوق میں
فرطِ عقیدت سے کہا یزداں
یہ ہم کافر
کہ دنیا کم نظر ناداں

سبھی لائے ہمارے سامنے اوراقِ پارینہ
کہ جن پر نقش تھے
اہلِ وفا کے عکس دیرینہ
شکستہ استخواں بے جان نابینا
جبیں سجدوں سے داغی
اور زخموں سے بھرا سینہ
اور ان کے بُت
مآلِ سوزِ اہلِ دل سے بے پروا
سبھی خود بین و خود آرا
ہر اک محمل نشیں تنہا
مگر مصروفِ نظّارا

اور اب ہم بھی گرفتہ دل
نہ محرومی کو سہہ پائیں
نہ بربادی چھپانے کے رہے قائل
وہ دست مرمر کی سِل
اور اہلِ سجدہ کی جبیں گھائل

سبھی کی بات سچ

اور ہم ندامت کے عرق میں تر بتر

شرمندگی کے کرب سے بسمل

چلو اب اپنے جیسے نامرادوں سے ہنسیں بولیں

جو وہ کہتے ہیں وہ ہو لیں

جبیں کے داغ آنکھوں کا لہو دھولیں

چلو اِس بُت کو بھی رولیں

نایافت میں اٹھائیس نظمیں اور اٹھائیس غزلیں شامل ہیں۔

جاناں جاناں (عطاءاللہ سجاد کے نام)

جاناں جاناں تک آتے آتے غزل کا شاعر ایک بار پھر غزل کی طرف پلٹ آتا ہے۔ نظم یہاں بھی موجود رہتی ہے مگر کم کم۔ کئی غزلیں ایسا قد وقامت نکالتی ہیں کہ گلی گلی شاعر کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ اُس کے شعروں پر لڑکیاں شدتِ جذبات سے دوپٹے بھگو لیتی ہیں اور نوجوان ملول ہو جاتے ہیں۔

ایک غزل تو زندگی کی پُرسکون ندی میں گویا تلاطم برپا کر دیتی ہے۔

اب کے تجدیدِ وفا کے نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی تو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تُو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جُدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سربہ زانو ہے کوئی سربگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بہ پا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہوئے اوراقِ پریشاں جاناں

اس ساری کتاب میں شاعر احتجاجی رومانویت کا علم بلند کرتا نظر آتا ہے۔اُسے برسوں کے بعد ایک دلربا سا شخص دکھائی دیتا ہے۔وہ قلم سرخرو ہے جیسی نظمیں لکھتا ہے اور خوشبو کا سفر دیکھنے میں مگن ہو جاتا ہے۔اور پھر ایسے شعر کہتا ہے:

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

جاناں جاناں میں پچپن غزلیں اور انیس نظمیں شامل کی گئی ہیں۔

شب خون (ڈاکٹر محمد شفیق کے نام)

اب ہمارا شاعر پھر نظم کی طرف آ گیا ہے۔حیران کن بات یہ ہے کہ اتنا عرصہ خوبصورت اور تسلسل کے ساتھ غزل کہنے والے شاعر نے اس مجموعے میں صرف ایک غزل شامل کی ہے۔بات یہ ہے کہ ہم دولخت ہو چکے ہیں۔ہمارا ایک بازو کٹ چکا ہے گھر آدھا رہ گیا ہے۔تقسیم کی دھوپ آنگن آنگن پھیل چکی ہے۔زخم ابھی نیا نیا ہے۔درد ابھی تازہ ہے اور المیہ یہ ہے کہ ایسے میں کوئی چارہ ساز بھی نہیں رہا۔ایسے میں فراز نظم لکھتے ہیں ''میری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ''۔

آج کے دن
مرا چہرہ مری آنکھیں لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں
وہی آنکھیں
جو گئے سال گئی تھیں تو نہ واپس آئیں
جو سرافرازی لوٹی ہیں نہ بے بس آئیں
وہی چہرہ
جو شفق بن کے کھلا تھا
نہ بنا صبح کا سورج
نہ مری شام کا پیوند ہوا
مری شعلہ بھری آنکھیں

مرا انگار سا چہرہ لاؤ
کہ مرے ہاتھ مرا دل
مرے بازو مرے ارماں
مرا سارا پیکر
خود کو پہچان سکے
وہ جو بھونچال نکل آیا تھا
جو گزری تھی قیامت
اسے نیرنگِ نظر جان سکے
میں ابھی زندہ ہوں
موجود ہوں
یہ میری انا مان سکے
آج کے دن ہی گئے تھے
مرے ساتھی
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لے کر
ان اندھیروں کے سمندر کی طرف
جہاں مرتی ہوئی شمعوں کی ضیا چیختی تھی
جہاں نفرت سے حقارت سے
ہر اک موجِ بلا چیختی تھی
کشتیاں کرب سے گرلاتی تھیں
ساحل کی ہوا چیختی تھی
مجھ کو معلوم تھا
بے جاں ہیں رجز کے نغمے
میرے لفظوں میں فنا چیختی تھی
اب نئے سال کی تقویم کا پہلا دن ہے
اور مرے پاس نہ شعلہ بھری آنکھیں ہیں
نہ انگار سا چہرہ ہے کہ میں

اپنے یاروں سے کہوں
تم تہِ دام سسکتے ہو
مگر ہم بھی سرِ شاخِ چمن
دل گرفتہ ہیں
کہ یارانِ صبا کب آئیں
ہم بھی ہر پھول کو ہر خار کو
سینوں سے لگائیں
گل و گلشن کو سجائیں
وہ جوانانِ چمن جب آئیں
نئی تقویم کے اوراق چمک اٹھیں
اور آئینوں میں
عکس بچھڑے ہوئے یاروں کے نظر سب آئیں
اے اسیرانِ عدو!
تم تو اس دیس کی مٹی ہو کہ جو
جس قفس میں بھی ہو
زنداں کی فضا مہکے گی
اب اسیری کے نامعلوم زمانوں کو مقدر کر لو
کس پہ افشا ہے
کہ آزردہ پرندوں کی زباں
کب چہکے!
جانے کس روز مرے شہر کو لوٹے گی
وہ غربت کی بہار
جس میں فصلِ گل و لالہ
نئی شمعوں کی طرح لپکے گی
اور فضا اس طرح دہکے گی
کہ محشر میں جہنم جیسے
ہر طرف آگ کے دریاؤں میں

شعلوں کا تلاطم جیسے
میری تقویم کے نوروز
پھر اُٹھیں گے
مرے زخم کا پرچم
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لے کر
سرِ میدانِ وفا تم جیسے
آج لیکن مری مانند
ہر اک صحن
ہر اک کھیت
ہر اک راہ میں
مفلوج ادھوار پیکر
چیختا ہے
مری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں

شب خون میں بیس نظمیں اور ایک غزل شامل کی گئی ہے۔ جبکہ ایک منظوم ڈرامہ سپاہی اور موت بھی شامل ہے۔

میرے خواب ریزہ ریزہ (شعیب سلطان کے نام)

احمد فراز نے ایک زمانے میں ریڈیو کے لیے منظوم ڈرامے لکھے تھے۔ یہ مجموعہ چار ڈراموں پر مشتمل ہے جس میں ''روشنیوں کا شہر''، ''ساحل کی ریت''، ''موم کے پتھر'' اور ''آخرِ شب کے ہم سفر'' شامل ہیں۔ یہ ڈرامے اپنی زبان میں بلا کی شعریت رکھتے ہیں۔ کردار جاندار اور کہانی پُر تحیر ہے۔ مکالمے رواں دواں اور زبان دلکش ہے۔ ان کے پہلے ڈرامے روشنیوں کے شہر کا چھٹا اور آخری منظر دیکھیے:

چھٹا منظر

(وہی پہلا منظر۔ کھڑکی سے روشنیوں کا شہر دکھائی دے رہا ہے۔
موسیقی کی آواز لوگوں کے قہقہوں میں گھلتی جا رہی ہے۔
کرسی خالی ہے۔ خالدہ کھڑکی سے لگی کھڑی باہر دیکھ رہی ہے)

خالدہ: (اپنے آپ سے) آہ یہ شام کس درجہ اندوہ گیں ہے
مگر آج بھی شہر کا ہے یہ عالم
کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہوا ہو
وہی روز کے زمزمے، قہقہے، قہقہے جیسے جشنِ طرب ہو
وہی جگمگاتے در و بام، روشن دریچے
وہی رقص گاہوں کے منظر
یہ نغموں کا سیلاب گیتوں کی کرنیں
بھڑکتے لبادوں میں خوش باش رنگیں، خوش بخت پیکر
وہی زندگی روشنی، روشنی زندگی
اور میرا مکاں۔ اے مصور، یہ تصویر میری نہیں ہے
نہیں..... میری دنیا میں اب تک اندھیرے بسے ہیں
یہاں ظلمتیں اب بھی نوحہ کناں ہیں مصور
مصور کی خیالی آواز: نہیں تم تو خود روشنی ہو
ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں
مجھے جگمگاتے ہوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا تھا
کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہوا چھوڑ کر
سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا
مصور کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
میں یہ جگمگاتا ہوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا
کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں
خالدہ: مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو
مگر...... ہاں۔ تمہیں اپنے فن سے غرض
اپنے بے جان رنگوں، ادھوری لکیروں سے
خاموش سایوں سے، ساکن ہیولوں سے الفت ہے
تم نقش گر ہو، تمہارے لیے زندگی میں
دھڑکتے دلوں، گنگناتے لبوں، جھلملاتے چراغوں لپکتی شعاعوں میں
کچھ بھی نہیں ہے!

فقط کاغذی بُت، خیالی صنم ہر دلاشیں
تمہاری نگاہوں کے مرکز.... مگر بولتی زندگی سے گریزاں

بوڑھا: (خیالی آواز) خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
خالدہ' کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

آمنہ: (خیالی آواز) خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر
تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

خالدہ: نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے
میں کب تک یہ لاشیں اٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں
مری زندگی سرد لاشوں کے بارِ گراں سے سسکنے لگی ہے
مصور! مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں ہے
کہ تم بھی اسی جگمگاتے ہوئے شہر کی اک کرن تھے
تمہارا وجود ایک زرتاب ذرہ تھا جو
اپنے مرکز سے پھر جا ملا
تم بھی اس شہر کے ایک جگنو تھے
جو ان اندھیروں میں اک پل کا مہمان تھا اور بس
اک کرن، ایک جگنو سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
یہ لاشیں
کہ جن کے لیے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
اب وہ بھی مجھ کو فقط باعثِ ننگ گردانتی ہیں
تو کیا وہ مقدس فریضہ مرا جرم تھا جس کی خاطر
میں اک لاش بن کر' اندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں
تو کیا یہ میری زندگی شپرک کی طرح
تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی
مرے سامنے اک طرف یہ چمکتا ہوا شہر ہے
روشنی کا سمندر ہے
جو سرد لاشوں سے بیگانہ ہنستی ہوئی زندگی کا جہاں ہے

اور اک سمت ساحل کی زنجیرِ ظلمت مری آرزوؤں کی قاتل
اُدھر روشنی..... زندگی
اور ادھر..... موت اور موت کی تیرگی
اگر یہ اُجالے مری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر، موت کی مستقل تیرگی کو نہ کیوں اپنا مسکن بنا لوں؟
میں اس نور و ظلمت کو اب توڑ دوں گی
فقط موت ہی میری اس کشمکش کا مداوا ہے
میں توڑ دوں گی یہ زنجیرِ ظلمت، شعاعوں بھرے شہر (دریچے سے چھلانگ لگاتی ہے)
(غمگین موسیقی)
آہ اے شہر، چمکتے ہوئے ہنستے ہوئے شہر
کتنا بے رحم ہے سفاک ہے تُو
تیرے بے خواب دریچوں کے اُجالے جلاد
تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا، تیغِ ستم
تیرے نغموں کی کھنک، ساغرِ سم
تیری ضو بار عمارات ہیں، مقتل گاہیں
تیری رعنائیاں، آنکھوں کا فریب
یہ ترا حسن ملمع ہے، نمائش ہے فقط
ریگِ رواں، موجِ سراب!
تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
تُو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
اے چمکتے ہوئے شہر
اے چمکتے ہوئے شہر

بے آواز گلی کوچوں میں (ڈاکٹر عطیہ کے نام)

اس مجموعے میں چھبیس نظمیں اور اٹھائیس غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ وطن سے دوری اور اپنے لوگوں سے فراق کا نوحہ ہے۔ یہ درد کبھی کبھی لَو دیتے دیتے بھڑکنے لگ جاتا ہے اور حصارِ جاں میں آتش فشاں بن جاتا ہے۔ تنہائی دیارِ غیر میں وطن کی یاد کے چراغ جلاتی رہتی ہے اور دل بے وطنی کے عذاب سہتا رہتا ہے۔ اسی مجموعے میں قیدِ تنہائی کی چند عبارتیں جو نظموں کی صورت میں اور ایک بدنما

صبح جو چور دروازے سے آئی ہوئی رات سے گزر کر آئی تھی کے بارے میں کچھ نظمیں شامل ہیں، انہی میں محاصرہ بھی ہے۔ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی لکھتے ہیں:

''تنہائی کا یہ احساس اس وقت اور بھی جان لیوا ہو جاتا ہے جب غریب الوطنی کی افتاد بھی آ پڑے۔ یہ غریب الوطنی بھی اسی حساس اور رویے کی دین ہے کہ اب آشفتہ سروں کے لیے اپنے وطن میں جگہ نہیں رہی۔ چمن میں اب اسی قبیلے کا فرد رہ سکتا ہے جو سمجھوتا کر سکتا ہو۔ جو مفاہمتوں کا خوگر ہو اور جو حالات کے رواں دھارے کے ساتھ ساتھ اپنی سچائیوں کے معیار بدلتا رہے۔ فراز کی غریب الوطنی اور جلاوطنی بھی اسی احساس کی پروردہ ہے کہ اپنے چمن میں چوں کہ کچھ نئی سچائیوں کا سکہ چلنے لگا ہے اور ان سچائیوں کے احترام کے لیے خواہش اور اختیار سے زیادہ جبر اور ذہنی صعوبت اٹھانا پڑتی ہے اس لیے وہاں اب دم گھٹنے لگا ہے۔

''بے آواز گلی کوچے'' فراز کو اب بھی آواز دیتے ہیں مگر فیصلہ یہی ہے کہ'' ذرا ادھر تازہ ہوا تو چلے''۔

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو!
میں اس شہر کا نغمہ گر
جو دو اک موسم غربت کے دکھ جھیل کے آیا
تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے
اپنی تھکی ہوئی اور ترسی ہوئی
آنکھیں سہلاؤں
اپنے دروازوں کے اُترے روغن کو
اپنے اشکوں سے صیقل کرلوں
اپنے چمن کے جلے ہوئے پودوں
اور گرد آلود درختوں کی
مُردہ شاخوں پر بین کروں
میری آنکھیں
برسوں کی ترسی ہوئی آنکھیں
چہروں کے آنگن بن جائیں
پھر میں اپنا ساز اٹھاؤں
آنسوؤں اور مسکانوں سے جھلمل جھلمل

نظمیں، غزلیں، گیت سناؤں

اپنے پیاروں

درد کے ماروں کا درماں بن جاؤں.....

میں نے جب چاہا، مگر چوں کہ شہر کے سارے راستے بند تھے اور ان پر پہرہ دینے

والے میری پہچان سے عاری تھے میں حرف وصوت کا آشنا تھا اور وہ اس سے بے خبر

تھے اس لیے آگے نہ جا سکا اور لوٹ آیا اور اب......

پھر انجانے شہروں کی شاہراہوں پر

مجبورِ سفر ہوں

جن کو تج کر گھر آیا تھا

جن کو تج کر گھر آیا تھا (بن باس)

''بے آواز گلی کوچوں میں'' سیاست کے وہ رنگ ہیں جن سے عوام الناس میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جب شہر کے سارے راستے ایک ہی سمت جاتے ہوں جب بات کرنے کی خواہش ہو اور بات نہ ہو سکتی ہو اور جب آوازوں کا بحران عہد در عہد پھیلا ہوا ہو تو خوف کی ایک عجیب سی چادر تن جاتی ہے جو گلیوں، بازاروں اور گھروں میں سکوت لے آتی ہے۔ وہ جو پہلے ہی بے زبان ہوں ان کے لیے تو یہ کوئی غیر معمولی صورت حال نہیں کہ ان کے لیے تو صدا اور سکوت ایک جیسے ہیں مگر جو ان کیفیات میں تمیز رکھتے ہیں سارا ماجرا انہی کا ہے۔ ایک خواب ہے فراز کا..... جو بکھر گیا ٹوٹ گیا اس کے نزدیک ایک عہد اس کے خواب کی شکست کا عہد ہے، ایک عہدِ زیاں ہے.... یہ اور بات ہے کہ ہر ایک کے عہد زیاں بھی الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ بالکل خوابوں کی طرح..... اپنے خوابوں کی طرح...... اور ''بے آواز گلی کوچوں میں'' فراز کے خوابوں کی شکست اور ایک عہد زیاں کی بات ہے جس نے اسے عدم تحفظ، غریب الوطنی، تنہائی گھٹن اور پابندئ زبان دی ہے۔''

نابینا شہر میں آئینہ (منصور جاوید کے نام)

اس مجموعے میں پینتالیس غزلیں ایک نعت اور پچپن نظمیں شامل ہیں۔ اس میں ایک ایسے شہر کا منظر نامہ ہے جس کے لوگ دیکھنے سے عاری اور بولنے سے قاصر ہیں۔ اس شہر میں قحطِ بینائی اس قدر ہے کہ بقول احمد فراز:

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے

تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

آنکھیں رکھنے والے لوگ بصارتوں سے محروم ہیں۔ ہوائیں بے آہٹ ہو گئی ہیں۔ آوازیں مر رہی ہیں، ایک سکتے کا عالم ہے اشفاق حسین لکھتے ہیں کہ:

"مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ وہ لکھو جو امیرِ شہر کہے اور دل کی یہ آرزو کہ کھل کر سچی بات لکھو۔ اسی دورا ہے پر فراز کی شاعری اپنی سمت اور منزل کا تعین کرتی ہے اور پھر دیکھنے والی آنکھیں فراز کے کلام میں وہ تحریریں نہیں دیکھ پاتیں جو امیرِ شہر کی ہاں میں ہاں یا اس کی مصنوعی تعریفوں کے قصیدے سے لبریز ہوں بلکہ اس کے یہاں امیرِ شہر کی بجائے غریب شہر کے رنج کا بیان اور اس شہر کے غموں کا ذکر زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں ملتا ہے، پھر پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ایسا شہر آ جاتا ہے جس کے درودیوار پر زنداں کی فصیلوں کا گماں گزرتا ہے۔"

شاعر خواب دیکھتا ہے اور پھر اسے اپنے خواب بیچنے پر مجبور کیا جاتا ہے اس صورتِ حال میں فراز کی نظم دیکھیے "ہم اپنے خواب کیوں بیچیں"

فقیرانہ روش رکھتے تھے
لیکن اس قدر نادار بھی کب تھے
کہ اپنے خواب بیچیں
ہم اپنے زخم آنکھوں میں لیے پھرتے تھے
لیکن رُوکشِ بازار ہم کب تھے
ہمارے ہاتھ خالی تھے
مگر ایسا نہیں پھر بھی
کہ ہم اپنی دریدہ دامنی
الفاظ کے جگنو
لیے گلیوں میں آوازہ لگاتے
"خواب لے لو خواب"
لوگو
اتنے کم پندار ہم کب تھے
ہم اپنے خواب کیوں بیچیں
کہ جس کو دیکھنے کی آرزو میں
ہم نے آنکھیں تک گنوادی تھیں

کہ جن کی عاشقی میں
اور ہَوا خواہی میں
ہر ترغیب کی شمعیں بجھا دی تھیں
چلو ہم بے نوا
محرومِ سقف و بام و در ٹھہرے
چلو ہم بد مقدر بے ہنر ٹھہرے
پر اپنے آسماں کی داستانیں
اور زمیں کے انجم و مہتاب کیوں بیچیں
خریدارو!
تم اپنے کاغذی انبار لائے ہو
ہوس کی منڈیوں سے درہم و دینار لائے ہو
تم ایسے دام تو ہر بار لائے ہو
مگر تم پر ہم اپنے حرف کے طاؤس
اپنے خون کے سرخاب کیوں بیچیں
ہمارے خواب بے وُقعت سہی
تعبیر سے عاری سہی
پر دل زدوں کے خواب ہی تو ہیں
نہ یہ خوابِ زلیخا ہیں
کہ اپنی خواہشوں کے یوسفوں پر تہمتیں دھرتے
نہ یہ خوابِ عزیزِ مصر ہیں
تعبیر جن کی اس کے زندانی بیاں کرتے
نہ یہ اُن آمروں کے خواب
جو بے آسرا خلقِ خُدا کو دار پر لائیں
نہ یہ غارت گروں کے خواب
جو اوروں کے خوابوں کو تہہِ شمشیر کر جائیں
ہمارے خواب تو اہلِ صفا کے خواب ہیں
حرف و نوا کے خواب ہیں

مہجور دروازوں کے خواب
محصور آوازوں کے خواب
اور ہم یہ دولتِ نایاب کیوں بیچیں
ہم اپنے خواب کیوں بیچیں؟

پس اندازِ موسم (احمد ندیم قاسمی کے نام)

اس مجموعے میں انچاس غزلیں اور چودہ نظمیں شامل ہیں، یہ اُن دنوں کی بات ہے جب جاں سے گزر جانے کا موسم آ گیا ہے۔ سچ پناہیں تلاش کر رہا ہے اور جھوٹ کی حکمرانی ہے۔ ایسے میں شاعر کہہ اٹھتا ہے:

کوچۂ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا

زندگی تصنع اور فریب کے ہاتھوں گھائل ہو چکی ہے مگر شاعر کا لہجہ اور عزم اور مضبوط ہو گئے ہیں اُسے ہوا کے سامنے چلنا آ گیا ہے وہ چاہتا ہے لوگ سچ کا ساتھ دیں اور جھوٹ کو بے نقاب کرنے میں شاعر کے ہم نوا بن جائیں۔ اس مجموعے میں جا بجا لوگوں سے مکالمے کی فضا دکھائی دیتی ہے ایک نظم ''اے مرے سارے لوگو'' دیکھیے

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی

پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں
پھر مرے شہر میں بارُود کی بُو پھیلی ہے
پھر سے ''تُو کون ہے میں کون ہوں'' آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میانِ من و تُو پھیلی ہے

مری بستی سے پرے بھی مرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اترا
آشنا ہاتھ ہی اکثر مری جانب لپکے
میرے سینے میں سدا اپنا ہی خنجر اترا

پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا
پھر ہوئیں عام وہی اہلِ ریا کی باتیں
نعرۂ حُبِ وطن مالِ تجارت کی طرح
جنسِ ارزاں کی طرح دینِ خدا کی باتیں

اس سے پہلے بھی تو ایسی ہی گھڑی آئی تھی
صبحِ وحشت کی طرح شامِ غریباں کی طرح
اس سے پہلے بھی تو پیمانِ وفا ٹوٹے تھے
شیشۂ دل کی طرح آئینۂ جاں کی طرح

پھر کہاں احمریں ہونٹوں پہ دعاؤں کے دیے
پھر کہاں شبنمیں چہروں پہ رفاقت کی ردا
صندلیں پاؤں سے مستانہ روی روٹھ گئی
مرمریں ہاتھوں پہ جل بجھ گیا انگارِ حنا

دل نشیں آنکھوں میں فرقت زدہ کاجل رویا
شاخِ بازو کے لیے زلف کا بادل رویا
مثلِ پیراہنِ گل پھر سے بدن چاک ہوئے
جیسے اپنوں کی کمانوں میں ہوں اغیار کے تیر
اس سے پہلے بھی ہوا چاند محبت کا دو نیم
نوکِ دشنہ سے کھنچی تھی مری دھرتی پہ لکیر

آج ایسا نہیں، ایسا نہیں ہونے دینا
اے مرے سوختہ جانو مرے پیارے لوگو
اب کے گر زلزلے آئے تو قیامت ہو گی
میرے دل گیر مرے درد کے مارے لوگو
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو

سب آوازیں میری ہیں (یوسف جمال کے نام)

یہ مجموعہ احمد فراز کے تراجم پر مشتمل ہے جس میں کل چھتیس نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ احمد فراز لکھتے ہیں کہ:

''سب آوازیں میری ہیں'' کے تراجم محض تخلیقی ہتھیاروں کو صیقل رکھنے کی غرض سے ہی نہیں کیے گئے بلکہ کچھ اور محرکات بھی تھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں خود انہی حالات سے گزر رہا ہوں جن سے بیشتر افریقی جلاوطن شاعر دوچار ہیں اور اپنی سرزمین سے دور اپنے لوگوں کی انقلابی جدوجہد میں قلمی حوالے سے شریک ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ پاکستان اور جنوبی افریقہ کے تاریخی اور سیاسی کوائف مختلف ہوتے ہوئے بھی کئی طرح کی مماثلت رکھتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت نے جس ظلم اور ڈھٹائی سے مقامی سیاہ فام اکثریت کو انسانی توقیر اور حقوق سے محروم کر رکھا ہے اسی طرح پاکستان میں فوجی آمریت نے بھی ظالمانہ اور غاصبانہ رویہ سے اپنے ہی لوگوں کو محکوم بنا رکھا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں بندوق کی لبلبی پر گوری انگلیوں کی جنبش حریت پرستوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے اور پاکستان میں جمہوریت پسند دانشوروں سیاسی کارکنوں، صحافیوں اور طلبہ کا لہو' زمین کا رزق بن رہا ہے۔ غالباً یہی بنیادی وجہ ہے کہ افریقی شاعری موضوعات کی حیرت انگیز مماثلت کے سبب پاکستان کے حالات کی بھی عکاس معلوم ہوتی ہے۔

ایک مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کہ جنوبی افریقہ کی بڑی اور سچی شاعری کو اُردو طبقہ سے بالعموم اور پاکستان کے ادیبوں شاعروں سے بالخصوص روشناس کرایا جائے۔ ساتھ ہی یہ احساس دلانا بھی مقصود ہے کہ جب خلقِ خدا ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہو اور لوگ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جانیں تک قربان کر رہے ہوں تو لکھنے والوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس تناظر میں ان کا کیا کردار ہونا چاہیے۔ میں اپنے مختصر پیش لفظ کو افریقی ادیب کے اس جملہ پر ختم کرتا ہوں ''صرف قیدی پرندہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیوں نغمہ سرا ہے۔''

موزیسی کوینو کی ایک نظم دیکھیے ''میری ہزاروں آوازیں ہیں۔

میری ہزاروں آوازیں ہیں
میں تمہیں وہاں سے پکاروں گا
جہاں سورج ڈوبتا ہے

میں تمہیں ان شاخوں سے آواز دوں گا
جو ہوا کا آنچل تھام کرناچتی ہیں
تم نہ ختم ہونے والی متاع ہو
جو نسلوں کے ہونٹوں سے گاتی ہے
تم ایک سرسبز تنا ہو
جس کی ہری بھری شاخیں
جھیل میں اتری ہوئی ہیں
جنہیں درخت کاٹنے والا
بے سود ذبح کر جاتا ہے
کہ بہار کے ساتھ ہی
ان میں زندگی کا تازہ خون
موج مارنے لگتا ہے
نئی کونپلیں پھر پھوٹ نکلتی ہیں
اور شاخیں جب پھلوں سے لد جاتی ہیں
تو قاتل
اپنے کلہاڑے اور تبر لے کر پھر آتا ہے
یہ سوچ کر
کہ یہ ہمیشہ کے لیے بانجھ ہو جائیں
وہ تمام پھلوں کو ہڑپ کر جاتا ہے
اس خوش فہمی میں
کہ اب ان پر بُور نہیں آئے گا
لیکن نئے موسموں میں
نئی کونپلیں پھر پھوٹ نکلتی ہیں

خوابِ گل پریشاں ہے (حمید اخوند کے نام)

اس مجموعے میں چالیس غزلیں بارہ نظمیں اور احمد ندیم قاسمی کا ایک مضمون شامل ہے۔ یہاں تک آتے آتے فراز کو اپنی بصارت پر بھی اعتماد ہے اور بصیرت پر بھی۔ وہ کلی طور پر امن، محبت اور انسانیت کا علم بلند کر چکا ہے۔ وہ آواز دیتا ہے تو صرف سچے لوگوں کو۔ وہ مظلوموں کا حامی بن چکا ہے اور

ظلم کے آگے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہے۔اگر چہ اس مجموعے میں فراز کی قبول عام غزل بھی شامل ہے لیکن میں یہاں احمد فراز کا ''انتساب'' ہی آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا تا کہ آپ پر بھی ساری صورتِ حال واضح ہو سکے۔

ہماری چاہتوں کی بزدلی تھی
ورنہ کیا ہوتا
اگر یہ شوق کے مضموں
وفا کے عہد نامے
اور دلوں کے مرثیے
اک دوسرے کے نام کر دیتے
زیادہ سے زیادہ
چاہتیں بدنام ہو جاتیں
ہماری دوستی کی داستانیں عام ہو جاتیں
تو کیا ہوتا
یہ ہم جو زیست کے ہر عشق میں سچائیاں سوچیں
یہ ہم جن کا اثاثہ تشنگی، تنہائیاں، سوچیں
یہ تحریریں
ہماری آرزومندی کی تحریریں
بہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں
فراق و وصل و محرومی و خورسندی کی تحریریں
ہم ان پر منفعل کیوں ہوں
یہ تحریریں
اگر اک دوسرے کے نام ہو جائیں
تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیا
شعر کے مدّاح
ہم پر تہمتیں دھرتے
ہماری ہمدمی پر طنز کرتے
اور یہ باتیں

اور یہ افواہیں
کسی پہلی نگارش میں
ہمیشہ کے لیے مرقوم ہو جاتیں
ہماری ہستیاں مذموم ہو جاتیں
نہیں ایسا نہ ہوتا
اور اگر بالفرض ہوتا بھی
تو پھر ہم کیا
سُبک سارانِ شہرِ حرف کی چالوں سے ڈرتے ہیں؟
سگانِ کوچۂ شہرت کے غوغا
کالے بازاروں کے دلالوں سے ڈرتے ہیں؟
ہمارے حرف جذبوں کی طرح
سچے ہیں، پاکیزہ ہیں، زندہ ہیں
بلا سے ہم اگر مصلوب ہو جاتے
یہ سودا کیا بُرا تھا
گر ہماری قبر کے کتبے
تمہارے اور ہمارے نام سے منسوب ہو جاتے!

بودلک: منظوم ڈرامہ (ڈاکٹر رفیق جان کے نام)

یہ ڈرامہ کیوں لکھا گیا اور کن حالات میں لکھا گیا اس کا احوال تو دوسرے مضمون میں آئے گا یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ڈرامہ چترال میں کافرستان وادی کے لوگوں کی بود و باش کے بارے میں ہے۔ یہ منظوم ڈرامہ ہے جو ریڈیو پاکستان کے لیے لکھا گیا۔ اپنے وقت میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں کل سات کردار ہیں پہلے منظر کا کچھ حصہ دیکھیے:

بودلک: قلاش میرے ہمدم
کہو کوئی اچھی خبر لے کے آئے ہو
میں صبح سے مضطرب تھا
تمہیں کیا خبر
مجھ پہ یہ رات کتنی کڑی تھی
میں اک پل بھی سویا نہیں

اور پھر ..... نیند آتی تو کیسے
جب کہ خوبصورت دلہن کی
جواں گرم سانسوں سے
میرا بدن
ایک چیتے کی مانند وحشی بنا تھا
تمہیں میری بے صبر آنکھوں نے نخلِ مقدس
کی جانب سے آتے
ہزاروں امیدوں سے دیکھا
یقیناً کوئی مژدۂ جانفزا لے کے آئے ہو
کیا تم نے نخلِ مقدس کے درویش دانا سے
میرے لیے بات کی.....؟
قلش .... بودلک پاک معبد کا درویش کب چاہتا ہے
کہ وہ تیرے بارے میں باتیں کرے
یا وہ مجھ سے ملے
کیوں کہ اس کو یہ شک ہے
کہ میں غیر لوگوں کی مشکوک حکمت کا پرچار کرتا ہوں
تم جانتے ہو
یہاں تیری موجودگی پاک روحوں کی آسودگی میں
خلل ڈالتی ہے
..... تجھے علم ہے بودلک
اجنبی حملہ آور یہاں سے مجھے اور کچھ دوسرے بدنصیبوں کو
پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف لے گئے تھے
مگر میری قسمت
کہ میں ان کے چنگل سے خود کو بڑی مشکلوں سے چھڑا کر
یہاں جب سے آیا ہوں
بستی کے پیرانِ دانا کے ادراک میں
ناپسندیدہ ہوں

اور نخلِ مقدس کا بوڑھا پروہت
مجھے دیکھنا تک نہیں چاہتا
کیوں کہ اس کو شبہ ہے
کہ میں غیر لوگوں میں رہ کر نئی طرز سے سوچنے لگ گیا ہوں

غزل بہانہ کروں (ڈاکٹر مہندر کے نام)

اس مجموعے میں تہتر غزلیں شامل کی گئی ہیں جو زیادہ تر اساتذہ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ اس میں آتش فشاں کے نام سے سیّد ضمیر جعفری کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔یہ مجموعہ الگ مزاج اور جداگانہ رنگ رکھتا ہے۔خالص غزل کے متلاشی یہاں اپنے ذوق کی تسکین محسوس کریں گے۔اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہنا کوئی آسان بات نہیں لیکن فراز نے تو غالب اور میر جیسے شاعروں کی زمینوں میں بھی کمال شعر نکالے ہیں۔یہاں میر کی زمین میں کہی گئی ایک غزل دیکھیے۔

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ
ہم نے اک عمر بسر کی ہے غمِ یار کے ساتھ
میر دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ
اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ
ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ
شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجیے گا
ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ
ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ
جو شرف ہم کو ملا کوچۂ جاناں سے فراز
سوئے مقتل بھی گئے ہیں اسی پندار کے ساتھ

"شعرِ سخن آراستہ ہے" کلیات (تمام محبت کرنے والوں کے نام)

یہ کلیات احمد فراز کی اب تک شائع ہونے والی تیرہ کتابوں پر مشتمل ہے جو 2004ء میں شائع ہوا ہے۔ فراز لکھتے ہیں کہ:

> "شعرِ سخن آراستہ ہے" میری ان تمام کتابوں کا مجموعہ ہے جو آج تک شائع ہو چکی ہیں۔ اب جب میں موجودہ کلیات کی ضخامت دیکھتا ہوں جو کہ سولہ سو چونسٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے تو مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیسے لکھ لیا۔ اچھی بری کی بحث تو الگ ہے ہو سکتا ہے ان میں کچھ تخلیقات وقت کے موسموں کے اثرات سے کچھ مرجھا گئی ہوں مگر مجموعی طور پر کئی مضامینِ دل و دنیا اب بھی تازہ تر لگتے ہیں"

اب ہم دیکھتے ہیں تو اِس کلیات میں تقریباً دو ساٹھ نظمیں اور چار سو ستائیس غزلیں شامل ہیں۔

اے عشقِ جنوں پیشہ

جو ابتدائے سخن ہے جو انتہائے سخن
تمہارے نام ہے ساری مری متاعِ سخن

اپنے کلیات کو ترتیب دینے کے بعد بھی احمد فراز کے تخلیقی انہماک میں ذرہ بھر کمی نہ آئی۔ 2007 میں اُن کی غزلوں پر مشتمل مجموعۂ کلام "اے عشقِ جنوں پیشہ" شائع ہوا۔ یہ مجموعہ احمد فراز کے تخلیقی جوہر اور تازہ افکار و تصورات میں رچی ہوئی شاعری کا بے مثال نمونہ ہے، اس میں شاعر کے اندر کے دکھ اور کرب کے علاوہ اپنی سرزمین، تہذیب و ثقافت، سماجی و سیاسی گھٹن، ناانصافی اور ہماری جمہوری اقدار کی پامالی جیسے مسائل اُس کی شعری تخلیقات کا سرچشمہ ہیں۔ جس میں شاعر عملی طور پر بھی شریک کار ہے۔ اس کتاب میں فراز صاحب کی نظمیں اور غزلیں ہماری گزشتہ دس سالہ تاریخ کا ایسا آئینہ اور ایسی زندہ تصویریں ہیں جس میں ہم اپنا چہرہ بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اس عرصے میں آمریت کے خلاف فراز صاحب کی عملی جدوجہد، اپنے اعزازات واپس کرنے اور سرکاری ادارے سے احتجاجاً علیحدگی اُن کی شخصیت اور شاعری کا ایسا روشن حوالہ ہے جسے اکیلے فراز صاحب ہی ادا کر سکتے ہیں اور یہ فریضہ انھوں نے ایسے ماحول میں ادا کرنے کی ٹھانی جہاں جنبشِ لب تو در کنار جنبشِ مژگاں بھی گنہ گار کرے ہے۔ اس آخری کتاب کے کچھ اشعار دیکھیے:

ادھر اُدھر سے کئی آ رہی ہیں آوازیں
اور اُس کا دھیان بہت انہماک چاہتا ہے

ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
روز آ جاتا ہے سمجھاتا ہے یوں ہے یوں ہے
شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فراز
یہ بھی اک سلسلۂ کُن فیکوں ہے یوں ہے

☆☆

عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
بعد میں سینکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں
پہلے پہلے ہوس اک آدھ دکاں کھولتی ہے
پھر تو بازار کے بازار سے لگ جاتے ہیں

☆☆

ہر طرح کی بے سروسامانیوں کے باوجود
آج وہ آیا تو مجھ کو اپنا گھر اچھا لگا

☆☆

فرازؔ عشق کی دنیا تو خوبصورت تھی
یہ کس نے فتنۂ ہجر و وصال رکھا ہے

☆☆

یہ عمر بھر کی مسافت ہے، دل بڑا رکھنا
کہ لوگ ملتے بچھڑتے رہیں گے رستے میں

☆☆

ہم تو چاہت میں بھی غالبؔ کے مقلّد ہیں فرازؔ
جس پہ مرتے ہیں اُسے مار کے رکھ دیتے ہیں

☆☆

ہم کہ شائستۂ تہذیبِ محبت ہیں فرازؔ
ہم نے رکھا نہ قدم حدِّ ادب سے آگے

☆☆

کوئی سخن برائے قوافی نہیں کہا
اک شعر بھی غزل میں اضافی نہیں کہا

اُس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی
شکوہ ناقدریِ دنیا کا کریں کیا کہ ہمیں
کچھ زیادہ ہی ملی جتنی محبت چاہی

☆☆

میرے ہی قتل نامے پہ میرے ہی دستخط
میری ہی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

☆☆

اس سے بڑھ کر کوئی انعامِ ہنر کیا ہے فرازؔ
اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ ہو جائے

☆☆

باغباں ڈال رہا ہے گل و گلزار پہ خاک
اب بھی میں چپ ہوں تو مجھ پر مرے اشعار پہ خاک
سرِ دربار ستادہ ہیں پئے منصب و جاہ
تُف بر اہلِ سخن و خلعت و دستار پہ خاک

☆☆

نہیں فرازؔ تو لوگوں کو یاد آتا ہے
وہ نغمہ سنج وہ خوش گفتگو وہ خواب فروش

☆☆

یہ کیا کہ تم بھی سرِ راہ حال پوچھتے ہو
کبھی ملو ہمیں بازار کے علاوہ بھی
سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقیں آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

☆☆☆☆

احمد فراز کی غزل

میرے خیال میں پہلا بولا جانے والا لفظ بھی شعر ہی کا حصہ تھا۔اور پھر وہ زندگی کے خمیر میں شامل کر دیا گیا۔شاعری صرف انسانوں ہی نے نہیں کی فطرت کی ہر چیز اپنے اپنے اسلوب میں شاعری کرتی ہے۔ہلکی ہلکی بارش کی نغمگی شاعری نہیں تو اور کیا ہے۔دھیمے دھیمے چلنے والی ہوا میں جب پتوں کی پازیبیں چھنکتی ہیں تو وہ شعر ہی تو ہوتے ہیں جن کی جلترنگ سے فضا نغمہ بار ہو جاتی ہے۔تہذیبوں کی آفرینش اور ارتقا میں جتنا دخل شاعری کا رہا ہے شاید ہی کوئی اور صنفِ ادب اس کے برابر آسکے۔شاعری نے حیات و کائنات کے سب دروں پر دستک دی ہے۔کئی بابِ حیرت وا کیے ہیں اور کئی پراسرار جہانوں کی سیر کرائی ہے۔شاعری خیال کے براق کی سوار ہے اور آج تک کوئی بھی رفتار خیال کی رفتار سے زیادہ ثابت نہیں ہو سکی۔

آج جب ہم اپنے عہد کے بڑے شاعر احمد فراز کا نام لیتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اسے فراز جیسا شاعر ملا ہے۔ابتدائے آفرینش سے محبت انسانوں کا سب سے اہم ترین موضوع رہا ہے۔حیرت کی بات ہے محبت جیسے موضوع کو فراز نے نئی وسعت اور تازگی دی ہے۔فراز نے اپنی شاعری میں جس عشق کی بات کی ہے وہ سچا اور خالص ہے۔انہوں نے کبھی اپنے عشق کو جھوٹ کی کھونٹی پر آویزاں نہیں کیا انھوں نے اپنی شاعری سے دلوں کو جوڑنے کا کام لیا ہے توڑنے کا نہیں۔انہیں خبر ہے کہ یہ آئینہ توڑنے میں تو ایک لمحہ لگتا ہے مگر اس کی کرچیاں چننے میں عمریں صرف ہو جاتی ہیں۔بڑے شاعر کی سچائی بھی بڑی ہوتی ہے۔وہ اپنے دامن میں جھوٹ کے پیوند لگا کر کالر میں سچائی کے سرخ گلاب نہیں لگاتا۔بڑا شاعر تو شیشے کی طرح ہوتا ہے،صاف شفاف،جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔یہ الگ بات کہ کئی کم نگاہ اتنی شفافیت سے آنکھیں ہی خیرہ کر بیٹھتے ہیں۔بڑا شاعر جس زبان میں بھی شاعری کرتا ہے اُسے بڑا کر دیتا ہے کوئی بھی زبان کبھی کسی شاعر کو بڑا نہیں کر سکی۔فراز نے اردو کو ایک آبرو بخشی ہے اُسے دنیا سے تکلم کا سلیقہ سکھایا ہے آج جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں فراز ہے اور جہاں جہاں فراز ہے وہاں اُردو کو فخر کرنا چاہیے کہ اسے ایسا شاعر نصیب ہوا ہے۔

غزل بڑی بدن گریز صنفِ شعر ہے یہ شہزادی خود پر کسی شاعر کا سایہ کم ہی پڑنے دیتی ہے یہ کسی کسی کے ہی دام خیال میں آتی ہے لفظ بذاتِ خود اتنا بدن چور ہے کہ اپنے ہم نسب شاعر کے علاوہ ہما شما سے دوفٹ دور جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

احمد فراز لفظوں کے قبیلوں کی تاریخ، تہذیب اور نسب سے واقف ہے اس کے شعری دروبست میں کوئی لفظ ترتیب مراتب پر شکوہ کناں نہیں ہوتا، ایسے لفظی سلیقے کی داد دینا پڑتی ہے۔ فراز کے ہاں فارسی اور اردو کی آمیزش سے زبان میں جو ایک الگ قسم کی حلاوت در آئی ہے، وہ دلکش بھی ہے اور فرحت انگیز بھی۔ فراز کے ہاں آسانی سے کہے گئے شعروں میں بھی ایک تمکنت اور شکوہ ہے۔ آج بھی جب غزل کے مستقبل کے بارے میں سوال اٹھتا ہے تو فراز ہی اس کا ایک جواب نظر آتا ہے۔ بڑے شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جس بھی صنف میں لکھتا ہے اُسے کمال عطا کر دیتا ہے۔ غالب نے تو قصیدے جیسی صنف کو بھی وہ اوج دیا کہ آج تک غالب کا قصیدہ فراموش نہیں کیا جا سکا۔

یہاں میں اس عہد کے ایک اور ممتاز شاعر احمد ندیم قاسمی کی رائے درج کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے بہت عرصہ قبل احمد فراز کی شاعری کے حوالے سے دے رکھی ہے:

> ''احمد فراز ادب برائے حیات کے ترجمان ہیں۔ مگر انہوں نے اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ اول و آخر فن کار ہیں اور جب فن کار حقیقت پسندی کے مطالبات پورے کرتا ہے تو جب بھی وہ فن کار یعنی خالق جمال ہی رہتا ہے۔ احمد فراز کی نظموں اور غزلوں میں ان کے فنکارانہ احساسِ ذمہ داری کا اظہار بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کا کلام صداقت پسندی اور جمالیات کا ایک ایسا سنگم ہے جو ابھی تک واضح طور سے صورت پذیر نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے لفظوں کے معانی کے علاوہ ان کی موسیقی کو بھی سمجھا ہے اور اسی لیے وہ پاکستان کے شمال مغربی سرحد کے باشندے ہونے کے باوجود زبان اور انداز بیان کے معاملے میں بڑی خود اعتمادی کا ثبوت دیتے ہیں۔ المختصر احمد فراز کی طرف پاکستان کا فنی مستقبل بڑی توقعات کے ساتھ نگراں ہے۔''

میرے خیال میں حاکم وہ نہیں جو جغرافیائی سرحدوں کے اندر حکومت کرتا ہو بلکہ حاکم وہ ہوتا ہے جس کی حکومت دلوں پر ہو اور دلوں کی حکومت سرحدوں کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔ فراز ہمارے عہد کا سب سے بڑا حاکم ہے اس نے مدتوں دلوں پر حکومت کی ہے اور اس کی سلطنت کا آفتاب اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ کوئی زمین اور کوئی مہتاب کبھی اس کے راستے میں نہیں آ سکا۔ کوئی اور سیارہ اسے کبھی نہیں گہنا سکا۔ خدا جب کسی کو بڑا بناتا ہے تو اسے بہت ساری خوبیاں ایک ساتھ دیتا

ہے۔فراز مشہور ترین شاعر نہیں۔بل کہ مقبول ترین شاعر ہے۔میں نے کہا تھا کہ فراز شیشے کی طرح ہے، صاف شفاف جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔وہ ہلکی سی ٹھیس سے ٹوٹ تو سکتا ہے کسی سنگِ مقتدر کے آگے جھک نہیں سکتا۔کسی بزرگ نے کہا تھا کہ انسان کو دو موقعوں پر جھکنا چاہیے ایک پھول توڑتے ہوئے اور دوسرے چشمے سے پانی پیتے ہوئے۔سو فراز بھی انہی دو موقعوں پر جھکتا ہے، ایک پھول توڑتے ہوئے اور دوسرے چشمے سے پانی پیتے ہوئے۔اس کے مزاج میں مصلحت ہے نہ مصالحت، وہ صرف اسی سے ہاتھ ملاتا ہے جس کی اسے دل اجازت دیتا ہے، کسی زمانے میں اس نے کہا تھا:

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

فراز نے اردو کی شعری روایت کو جس سلیقے اور خلوص سے آگے بڑھایا ہے زمانہ مدتوں ان کا معترف رہے گا۔اُردو غزل کو جتنے اچھے شعر فراز نے دیے ہیں شاید ہی کسی اور شاعر کے حصے میں آئے ہوں۔فراز جس چابکدستی سے شعر کی اس سرپھری شہزادی کو اپنی دسترس میں لاتے ہیں وہ مشاق کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔آج بھی ہم جب فراز کے شعروں کا انتخاب کرنے بیٹھتے ہیں تو ہر مصرعے پر ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است'' دیکھیے کچھ شعر اور پھر فراز کی تین مختصر غزلیں:

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

☆

فرازؔ ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

☆

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

☆

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

☆

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

سورج کی دوستی پہ جنہیں ناز تھا فرازؔ
وہ بھی تو زیرِ سایۂ دیوار آ گئے

☆

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرازؔ
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

☆

غرورِ جاں کو مرے یار بیچ دیتے ہیں
قبا کی حرص میں دستار بیچ دیتے ہیں
یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خواہشوں کے لیے
تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں
جنونِ زینت و آرائشِ مکاں کے لیے
کئی مکیں در و دیوار بیچ دیتے ہیں
ذرا بھی نرخ ہو بالا تو تاجرانِ حرم
گلیم و جُبہ و دستار بیچ دیتے ہیں
بس اتنا فرق ہے یوسف میں اور مجھ میں فرازؔ
کہ اس کو غیر مجھے یار بیچ دیتے ہیں

☆

چاکِ پیراہنِ گل کو صبا جانتی ہے
مستیِ شوق کہاں بندِ قبا جانتی ہے
ہم تو بدنامِ محبت تھے سو رُسوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلقِ خدا جانتی ہے
کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہگذر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے
ہوس انعام سمجھتی ہے کرم کو تیرے
اور محبت ہے کہ احساں کو سزا جانتی ہے

☆

یوسف نہ تھے مگر سرِ بازار آ گئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آ گئے
ہم کج ادا چراغ کہ جب بھی ہوا چلی
طاقوں کو چھوڑ کر سرِ دیوار آ گئے
پھر اِس طرح ہوا مجھے مقتل میں چھوڑ کر
سب چارہ ساز جانبِ دربار آ گئے
اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ مرے یار آ گئے
آواز دے کے زندگی ہر بار چُھپ گئی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آ گئے
سورج کی دوستی پہ جنہیں ناز تھا فرازؔ
وہ بھی تو زیرِ سایۂ دیوار آ گئے

پروفیسر شمیم حنفی کے بقول:

''ہمارے عہد کے عام جدید شاعروں کے برعکس فراز کی شاعری کا عقبی پردہ مغربی زبانوں کے ادب یا شعری ہیئتوں کے بجائے فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری نے نے مہیا کیا ہے۔اُن کی زبان وبیان میں فارسی غزل اور اردو کی کلاسیکی غزل کے رنگ صاف جھلکتے ہیں۔اساتذہ کی زمینوں میں انھوں نے بہت سی غزلیں کہی ہیں اور ان میں بھی اُن کی ترجیحات سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، غالبؔ اور میر کے قائم کردہ اسالیب کی پابند ہیں۔فراز کا امتیاز یہ ہے کہ اساتذہ کی پیروی کرتے ہوئے بھی وہ اپنا تشخص محفوظ رکھتے ہیں اور اساتذہ کے شب چراغ کی روشنی سے فیض اٹھانے کے باوجود اپنی تخلیقیت کو بجھنے نہیں دیتے۔''

فراز کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے بعض ایسے شعر کہے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں کہے گئے۔مثال کے طور پر اساتذہ کی زمینوں میں ان کی غزلوں سے یہ چند اشعار دیکھیے:

منتظر کب سے تحیر ہے تری تقریر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا
رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ
تم ہو نا خوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فرازؔ
لوگ رہتے ہیں اسی شہرِ دلِ آزار کے بیچ
☆☆
اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ
ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ
☆☆
مرے حریف کھلے دل سے اب شکست بھی مان
نہ یہ کہ فرطِ ندامت سے منہ پہ چادر کھینچ
☆☆
آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون
☆☆
رہِ وفا میں حریفِ خرام کوئی تو ہو
سو اپنے آپ سے آگے نکل کے دیکھتے ہیں
☆☆
یہ رعونت تابکے اب دلِ فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت
☆☆
اتنے سکوں کے دن کبھی دیکھے نہ تھے فراز
آسودگی نے مجھ کو پریشان کر دیا
☆☆
سنا ہے کل جنھیں دستارِ افتخار ملی
وہ آج اپنے سروں کو تلاش کرتے ہیں
☆☆

رکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ فراز کے ہاں کتنی شدت اظہار اور ندرتِ بیان ہے۔اس کی غزل کہیں الاؤ اور کہیں بازارِ آتش دکھائی دیتی ہے۔اُسے ٹین ایجر اور عام سطح کا شاعر کہنے والے شاید اندر سے خوفزدہ ہیں۔کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اُردو غزل میں اس انداز کا شعر کبھی پہلے کہا گیا ہے۔

ذکر اُس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

احمد فراز کی غزل بعض اوقات کوہستانی ندی کا سا اضطراب لیے ہوتی ہے ان کے ہاں جذبے کی شدت نے محبت کو عشق کا درجہ دے کر اُسے لازوال بنا دیا ہے۔نرم خُو مترنم بحروں میں غزل کہنے والا یہ شاعر اتنی آسانی سے آہوئے غزل شکار کرتا ہے کہ خیال پر الہام کا گماں ہونے لگتا ہے۔

احمد فراز نے کچھ عرصہ قبل ایک ایسی غزل کہی ہے جو اُردو کی شاہکار غزلوں میں شمار ہونے لگی ہے۔یہ غزل خود شاعر کو بھی پسند ہے۔اُردو میں اتنے زیادہ اچھے شعر شاید ہی کسی ایک غزل میں آئے ہوں۔

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط ہے اُس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
سو ہم بھی اُس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اُسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اُسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے حشر ہیں اُس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اُس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اُس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
سو اُس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اُس کی
جو سادہ دل ہیں اُسے بن سنور کے دیکھتے ہیں
سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے چشمِ تصور سے دشتِ امکاں میں
پلنگ زاویے اُس کی کمر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
وہ سرو قد ہے مگر بے گلِ مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں
بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں
رُکے تو گردشیں اُس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اُس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
کسے نصیب کہ بے پیرہن اُسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں
اب اُس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

میں سمجھتا ہوں: ''اُردو غزل اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اُسے فراز جیسا شاعر نصیب ہوا ہے۔ بڑی حیران کن بات ہے کہ محبت جیسے قدیم موضوع کو بھی فراز نے تازگی اور وسعت دی ہے۔ ان کی غزل میں ایک تمکنت اور شکوہ ہے۔ وہ جس طرح غزل کے دشوار گزار راستے سے گزرے ہیں ان کے شعر خود ہی اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ فراز نے اُردو شاعری کو جتنے زیادہ اور اچھے شعر دیے ہیں وہ شاید ہی کسی اور شاعر کے حصے میں آئے ہوں۔ جو لوگ اس دور میں شاعری کر رہے ہیں انہیں فخر ہونا چاہیے کہ وہ فراز کے ہم عصر ہیں۔''

خیال اور لفظ کو موم کی طرح گداختہ کر کے شعر میں ڈھالنے کا فن جو احمد فراز کی غزل میں نظر آتا ہے۔ احمد فراز کی غزل میں جو فنی گداز ہے وہ کسی اور شاعر کے ہاں شاید ہی ملے۔ جہاں جہاں جو شعر وارد ہوا ہے اس میں فکری وحدت ایسی ہے کہ کسی طرح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بہت سہولت کے ساتھ کہے گئے شعروں میں بھی فکر کا ایک جہاں آباد ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں تراکیب سازی کا عمل اتنا زیادہ نہیں مگر پھر بھی شعری منظر نامہ ایک کائنات متشکل کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی مثال ان شعروں سے دی جا سکتی ہے۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تُو بہت دیر سے ملا ہے مجھے
ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اِک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

☆

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

☆

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

☆

پھر تُو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

☆

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فرازؔ تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

احمد فراز کی غزل میں جمالیاتی پہلو اپنی تمام تر رنگینی اور دلکشی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ ہیں ہی جمال کے شاعر بلکہ ان کے کلام میں جمال کی جادوگری جا بجا نظر آتی ہے۔ وہ ایک کیمیا گر کی آنکھ رکھتے ہیں اور ان کی نگاہ سیدھی لفظی گوہر پر پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنی غزل میں علامت اور استعارے کو زندگی کرنا سکھایا ہے۔ وہ اقلیم سخن سے جس بے نیازی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ یہی بات انہیں درویشی کے قریب لے آتی ہے۔

شعر ایک قسم کی سادگی اور بے ساختگی مانگتا ہے بہت ہوشیاری کے ساتھ کہے گئے مصرعے بھی بعض اوقات شعری حسن خراب کر دیتے ہیں اس بے نیازی اور بے ساختہ پن کے حوالے سے ان کی ایک غزل دیکھیے:

کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہوا سو ہوا
کہ دل گنوا کے اب آنکھیں نہ کھو، ہوا سو ہوا
کوئی اُسے نہ سنائے ہمارا حالِ خراب
مبادا اُس کو بھی افسوس ہو، ہوا سو ہوا
جدائیوں کے زمانوں کا پوچھتے کیا ہو
گزر گئی جو گزرنی تھی، جو ہوا سو ہوا
محبتوں میں عجب تو نہیں اُجڑ جانا
سو مجھ کو دیکھ کے حیراں نہ ہو ،ہوا سو ہوا
ہزار اور بھی دُکھ دل نے پال رکھے ہیں
چلو یہ عشق کا آزار تو، ہوا سو ہو
وفا میں ہم بھی کہاں ایسے خوش معاملہ تھے
فقط اسی سے گلہ کیوں کرو ،ہوا سو ہوا
فرازؔ خوش ہو متاعِ ہُنر سلامت ہے
بلا سے عشق کی بازی میں جو، ہوا سو ہوا

یہ تو تھی احمد فراز کی غزل جس نے ایک عالم کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ان کی غزل دلوں کو آباد اور روح کو شاداب کرتی ہے۔محبت کرنے والے آج بھی اظہارِ محبت میں فراز کے شعر استعمال کرتے ہیں۔گانے والے انہیں اپنا محسن مانتے ہیں کہ یہ نغمگی اب غزل میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔وہ زندگی کے نبض آشنا ہیں۔رموزِ دلبری کے موجد ہیں۔گیسوئے جاناں کے گرہ کشا اور محفلِ یاراں میں دلربا۔
جب تک اُردو ہے فراز ہے اور اس کی غزل ہے اور اب فراز کے کچھ اور شعر دیکھیے:

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ چلو

☆

آج اِک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

☆

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تُو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

☆

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

☆

دیکھا مجھے تو ترکِ تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اُسی کا تھا

☆

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اُس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

☆

یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خواہشوں کے لیے
تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں

☆

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

☆

میں نے ستم گروں کو پکارا ہے خود فرازؔ
ورنہ کسی کا دھیان کہاں تھا مری طرف

اور اب احمد فراز کی چند منتخب غزلیں ملاحظہ کیجیے:

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فرازؔ آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فرازؔ پنکھڑی تھی

☆☆

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خودنہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دُور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ
ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ
ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فرازؔ
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

☆☆

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے
زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے
دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

☆☆

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے
یہ کن نظروں سے تُو نے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے
ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

غلط ہے جو سُنا، پر آزما کر
تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے
یہ محرومی نہیں پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے
یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے
یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے
فرازؔ اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جُدا دیکھا نہ جائے

☆☆

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اُس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے
تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے
جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے
یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پہ
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے
اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے
جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے
کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فرازؔ
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

☆☆

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ
باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گل فروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ
قاتل اِس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ
کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ
تم ہو نا خوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فراز
لوگ رہتے ہیں اسی شہرِ دل آزار کے بیچ
☆☆
گلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چُپ رہا ستمِ ناروا کے ہوتے ہوئے
یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
ہے آشنا کی طلب، آشنا کے ہوتے ہوئے
وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں شمار کریں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے ہوتے ہوئے
نہ چاہنے پہ بھی تجھ کو خدا سے مانگ لیا
یہ حال ہے دلِ بے مدعا کے ہوتے ہوئے
نہ کر کسی پہ بھروسا کہ کشتیاں ڈوبیں
خدا کے ہوتے ہوئے ناخدا کے ہوتے ہوئے
مگر یہ اہلِ ریا کس قدر برہنہ ہیں
گلیم و دلق و عبا و قبا کے ہوتے ہوئے
کسے خبر ہے کہ کاسہ بدست پھرتے ہیں
بہت سے لوگ سروں پر ہما کے ہوتے ہوئے
فراز ایسے بھی لمحے کبھی کبھی آئے
کہ دل گرفتہ رہا دلرُبا کے ہوتے ہوئے

تُو جو چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کاہے تو میں ہوں
تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تیرا غم اپنے تعلق کو نباہے تو میں ہوں
دل نے کب شیوۂ دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پہ نہ ہوا میں سرِ راہے تو میں ہوں
جانے کیا رنگ دکھاتی ہے بہاراں اب کے
دل دریدہ و پریشاں نگاہے تو میں ہوں
تُو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یارا! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں
حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں ہوں
اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فرازؔ
صاحبِ خرقہ و پیوند کُلا ہے تو میں ہوں

☆☆

باغباں ڈال رہا ہے گُل و گلزار پہ خاک
اب بھی میں چپ ہوں تو مجھ پر مرے اشعار پہ خاک
سرِ دربار ستادہ ہیں پئے منصب و جاہ
تُف بر اہلِ سخن و خلعت و دستار پہ خاک
آ کے دیکھو تو سہی شہر مرا کیسا ہے
سبزہ و گُل کی جگہ ہے در و دیوار پہ خاک
بس کہ اک نانِ جویں رزقِ مشقت تھا فرازؔ
آ گیا ڈال کے میں درہم و دینار پہ خاک

☆☆

سبھی کہیں مرے غم خوار کے علاوہ بھی
کوئی تو بات کروں یار کے علاوہ بھی

یہ کیا کہ تم بھی سرِ راہ حال پوچھتے ہو
کبھی مِلو ہمیں بازار کے علاوہ بھی
اجاڑ گھر میں یہ خوشبو کہاں سے آئی ہے
کوئی تو ہے در و دیوار کے علاوہ بھی
سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقیں آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی
کبھی فرازؔ سے آ کر ملو جو وقت ملے
یہ شخص خوب ہے اشعار کے علاوہ بھی

☆☆

سب قرینے اُسے دلدار کے رکھ دیتے ہیں
ہم غزل میں بھی ہنر یار کے رکھ دیتے ہیں
ہم تو چاہت میں بھی غالب کے مقلد ہیں فراز
جس پہ مرتے ہیں اُسے مار کے رکھ دیتے ہیں

☆☆

اس کا اپنا ہی کرشمہ ہے فسوں ہے یوں ہے
یوں تو کہنے کو سبھی کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
تم نے دیکھی ہی نہیں دشتِ وفا کی تصویر
نوکِ ہر خار پہ اک قطرۂ خوں ہے یوں ہے
تم محبت میں کہاں سود و زیاں لے آئے
عشق کا نام خرد ہے نہ جنوں ہے یوں ہے
ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
روز آ جاتا ہے سمجھاتا ہے یُوں ہے یُوں ہے
شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فرازؔ
یہ بھی اک سلسلۂ کن فیکوں ہے یوں ہے

آپ نے دیکھا احمد فراز کی غزل میں آج بھی وہی تمکنت اور دل نشینی ہے جو شروع میں تھی۔ ساٹھ برس سے شعر کہنے والے اس شاعر کا قلم آخری وقت تک نہیں تھکا بلکہ اُسی توانائی اور تسلسل کے ساتھ گلشنِ غزل کی آبیاری کرتا رہا ہے۔ اب تک ہم نے جوبات کی وہ فراز کے مطبوعہ کلام پر تھی مگر اب

بھی کچھ کلام ایسا ہے جو اشاعت پذیر نہیں ہوا۔ اُن کی اِن غیر مطبوعہ غزلوں میں بھی وہی تہذیبی رچاؤ اور چاشنی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ عمر کے آخری حصے تک بھی اگر کسی شاعر کا سانس نہ ٹوٹا ہو تو اُسے قدرت کی عطا ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان غزلوں میں شہر اور شہر یار دونوں شاعر کے نشتر کی زد میں ہیں۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار کو باہم آمیز کر کے دکھانے والے اس شاعر نے محبت کو نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ یہاں بھی وہی بے خبری اور بے نیازی ہے جو ان کی پہلی غزلوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ احمد فراز کی مکمل غزل کا احاطہ کرنا تو بہت دشوار ہے لیکن ہم نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ان کی غزل کے چند پہلو آپ کے سامنے رکھ دیے جائیں۔

☆☆☆☆

احمد فراز کی نظم

احمد فراز کی نظم اس فکر و احساس سے ترتیب پاتی ہے جو ہمارے ماضی اور حال سے جڑا ہوا ہے۔ سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ ہم اخلاقی طور پر بھی گراوٹ کا شکار ہیں۔ ہماری عظمتِ رفتہ ہم سے چھن چکی ہے۔ ہمارا موجود بھی ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ ہم ابھی تک خمارِ ماضی سے باہر نکل ہی نہیں پائے۔ یہاں کہیں کہیں فراز کی نظم رجزیہ اور احتجاجی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ بل کہ یہ کہا جانا چاہیے کہ فراز کا لہجہ شروع سے آخر تک احتجاجی اور مزاحمتی ہے۔ وہ برے سے برے حالات کے آگے بھی سپر نہیں ڈالتے بل کہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ شاعر اپنی نظم میں فکری سطح پر زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ فراز کی نظم کے بارے میں ناقب رزمی لکھتے ہیں:

> ''احمد فراز کی شاعری مواد اور اسلوب دونوں کے حوالے سے بلند پایہ اور منفرد ترقی پسند شاعری کے ضمن میں آتی ہے۔ وہ ایک متوازن نقطۂ نظر رکھتا ہے، اسی لیے اس نے ادبی جدیدیت کے کسی غلط انداز کو اختیار کر کے اپنے فن کو ابہام زدگی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اس کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کسی موقع پر بھی اردو شاعری کی کلاسیکیت کا دامن نہیں چھوڑا۔''

وہ ایک ترقی پسند دانشور ہے جو انسانی معاشرے کی بہتر تقلیب کا خواہاں ہے اور زندگی کو مساوات، اخوت، خوشحالی اور خیر و امن کے ماحول میں محوِ رقص اور سرخوش دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ محض فطرت کی عکاسی زندگی کے سطحی پہلوؤں کے اور حالت برقرار موجود (Status Que) کی یکسانیت کے بیان پر اکتفا نہیں کرتا بل کہ ان معروضی اسباب تک پہنچتا ہے جنہوں نے تیسری دنیا کے محنت کش عوام کو ناداری بیماری جہالت اور بدحالی کا شکار بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے کو بہتر خطوط پر بدلنے ہی میں راہِ نجات ڈھونڈتا ہے۔ لیکن وہ خوب جانتا ہے کہ استحصالی نظام نے عوام پر خیر و امن اور خوشحالی کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اس لیے وہ استحصالی طبقوں کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فریضہ سمجھتا

ہے کہ عوام میں سماجی بیداری اور طبقاتی شعور پیدا ہو۔ کیوں کہ طبقاتی جدوجہد کے لیے طبقاتی شعور ایک لازمہ ہے۔ احمد فراز نے اپنے تغیر آفریں فن کے سحر سے اپنے اس فریضے کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔''

احمد فراز کی نظم ہماری مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ وہ اس نظم میں عہدِ گزشتہ میں ہونے والی درباری سازشوں، سیاستوں اور کاسہ لیسوں کی دربار نواز چالوں کا ذکر بڑی دردمندی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اُن کی نظم کھنڈر دیکھیے۔

عبث کیوں اُلٹتے پلٹتے ہو جھوٹی روایات کی عظمتوں کے کھنڈر
یہاں کچھ نہیں ہے
یہاں تم نہ پاؤ گے کوئی خزانہ
نہ شدّاد کی جنتِ گمشدہ کا کوئی لعل و دُر سے جڑا آستانہ
نہ فرعون کا کوئی خفیہ خزینہ
نہ قاروں کا کوئی دفینہ
نہ جمشید کے جام و مینا
نہ نمرود کے باغ آغوش کی چہچہاتی ہوئی کوئی الھڑ حسینہ
یہاں کچھ نہ ڈھونڈو
یہاں کچھ نہیں ہے
یہاں خشک و ویران خطوں میں
مدت سے خانہ برانداز عفریت چاروں طرف خیمہ زن ہیں
یہاں سالہا سال سے قرن ہا قرن سے
وحشت انگیز اوہام سایہ فگن ہیں
یہاں بے شمار الّوؤں کے بسیرے ہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے ہیں اور
گیدڑوں نے کئی غار کھودے ہوئے ہیں
جو دن کے دھندلکوں میں شب کی سیاہی میں آسیب صورت
کبھی ایک ایک اور کبھی سب کے سب مل کے یوں چیختے ہیں
کہ جیسے بنی نوعِ انساں کی تخریب پر نوحہ گر ہوں
یہاں کوئی تپتی ہوئی دوپہر ہو کہ سرما کی تاریک و مفلوج شب ہو
کبھی کوئی ابرِ خراماں نہ برسا نہ چھایا

یہاں کوئی شعلہ نہ بھڑکا نہ کوئی چراغِ سحر ٹمٹمایا
کہ جیسے ہمیشہ پرافشاں رہا ہو یہاں اجنبیت کا گھمبیر سایہ
کہ اس سرزمیں کی فضا میں خلا میں کبھی بھی کوئی بھی تغیر نہ آیا
مگر یہ کھنڈر
روزِ اول سے ہی
پتھروں اور اینٹوں کے انبار ہائے پریشاں نہیں تھے
فقط ادھ کٹے بُت شکستہ ستوں ٹوٹے پھوٹے ظروف
اور جھکے بام و در یونہی سر در گریباں نہیں تھے
یہاں صرف ویرانیوں کے مناظر ہی تاریخِ ماضی کے عنواں نہیں تھے

یہ وہ سرزمیں ہے
کہ جس پر زمرد کے یاقوت کے تخت جلوہ فگن تھے
یہاں سنگِ سرخ اور مرمر کے بے مثل وادر محلات
گلکاریوں سے مرصع تھے معراجِ فن تھے
یہاں بے بہا اور نایاب قالین فرشِ رہِ کاخِ فرمانروائے زمن تھے
یہاں ریشم و اطلس و پرنیاں اور دیبا و زربفت و سنجاب کمخواب
کے بے نظیر اور عریاں ذخیرے شکن در شکن تھے
یہاں لہلہاتے ہوئے گلستاں رشکِ باغِ عدن تھے
یہاں سونے چاندی کے ڈھیروں میں لعل و جواہر میں
تلتی کنیزوں کے گلرنگ چہرے فضا تاب سینے سنہرے بدن تھے
اور ان کی حفاظت کی چوبی صلیبیں تھیں زندانِ آہن تھے دار و رسن تھے
یہاں کاس وقیثارکی گرم تانوں سے جام و سبو کے فسانوں سے
عیش و نشاط و مسرت کے جشنِ چراغاں منائے گئے ہیں
یہاں خوش گلو اپسراؤں کے ہر تارِ گیسو سے تزئینِ ربط روا تھی
یہاں زندگی صرفِ زخمِ نوا تھی!!
یہاں باادب باسلیقہ غلاموں نے سجدے کیے او ثبوتِ وفا کے لیے
گردنیں تک کٹا دیں
مگر رحم دل اور کشادہ دل آقاؤں کی عدل و انصاف سے

جگمگاتی جبینوں پہ کوئی شکن تک نہ آئی
بایں حال بھی مطمئن تھی خدائی
مگر وقت کی پے بہ پے کروٹوں نے کئی گل کھلائے
کبھی تو ہلاکو و چنگیز و تیمور نے بربریت کے پرچم اٹھائے
کبھی تو رماں اور نادر کی جرار فوجوں نے یلغار کی شہر لوٹے جلائے
تباہی کے دف صورِ محشر کی صورت ہر اک سمت بھونچال لائے
بگولوں کے دامن میں امن و سکوں کے درخشندہ فانوس جلنے نہ پائے
اور اپنی روایات کے تلخ و تیرہ دھوئیں چھوڑ کر بجھ گئے مٹ گئے ہیں
یہ کہنہ روایات جن کی گھنی ظلمتوں میں نہ جادہ نہ منزل
غبار رواں کی طرح چھا رہی ہیں
دلوں کو دماغوں کو نظروں کو بھٹکا رہی ہیں
اور ان کی جلو میں نہ لیلا نہ محمل
نہ جذبِ تجسس کا حاصل
یہاں کچھ نہیں کچھ نہیں ہے
فقط کچھ کھنڈر ابنِ آدم کی تاریخ پر منفعل ہیں

آپ نے دیکھا یہ نظم ہمارے عہدِ گزشتہ کا منظر نامہ کس خوبصورت انداز میں پیش کر رہی ہے بل کہ یہ صرف ہماری تاریخ ہی کا منظر نامہ نہیں تاریخوں کا منظر نامہ ہے۔ یہاں ایک مکمل نظم گو اپنی پوری فنی گرفت کے ساتھ ہمارے ساتھ مخاطب ہے۔ نظم کی ایک ایک سطر معنی کے دریا لیے ہوئے ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ نظم جس قسم کی فضا اور ڈکشن کا تقاضا کرتی تھی شاعر نے وہی ڈکشن اور فضا برقرار رکھی ہے۔ لفظ نہیں گویا آئینے جڑے ہیں جن میں ماضی عکس در عکس ہمارے سامنے آتا جا رہا ہے۔ زندگی رُکی نہیں اور بھی تیز خرام ہو گئی ہے۔ کھنڈر بول اٹھا ہے، یوں لگتا ہے شاعر نے لفظوں کو زندگی عطا کر دی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نظم میں حیرت اور طلسم کا عنصر پورے جاہ و جلال کے ساتھ ہمارے روبرو ہے، جو ماضی کا خاصا ہے، مگر اس ساری بنت اور ترتیب کے ہوتے ہوئے نظم کا حسن مجروح ہونے کی بجائے اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"آزادی کے بعد ہندو پاکستان ہی نہیں ایشیا اور افریقہ کے دوسرے نو آزاد ملکوں میں بھی جمہوری عمل، انسانی حقوق اور انسانی وقار کو بے دردی سے کچلا گیا۔ پاکستان میں طرح طرح کی آمریتوں نے سیاسی کرتب دکھائے،

نوجوانوں اور محنت کش انسانوں کی اجتماعی تحریکوں اور ان کی حمایت کرنے والے ادیبوں اور دانشوروں پر ہر طرح کی جبر و بیداد روا رکھی گئی۔ احمد فراز کی نظموں میں ان تمام حقائق کے زندہ اور متحرک نقوش تابناک نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں احساس کی ایسی شدت تخلیقی توانائی اور حسن ہے کہ عصری حقائق کی ترجمانی کے باوجود آج بھی ان میں ایک انوکھی تازگی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر محاصرہ، شہر آشوب، نئی مسافت کا عہدنامہ، جانشین قلم سرخرو ہے۔ اب کس کا جشن مناتے ہو؟ جیسی نظمیں جمالیاتی تکمیل کی نادر مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں قلم اور قلم کار کی حرمت کا پرچم بلند نظر آتا ہے" بقول احمد فراز

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو فقیروں سے سرفراز کرے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو امانت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے

بے شک ہمارے اس شاعر نے جب بھی لکھا تپاکِ جاں سے لکھا ان کی نظموں میں قلم کی حرمت اور لہو کی عظمت کا پرچم بلند ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک کھرے اور سچے فلکار ہیں۔ جھوٹ، مصلحت اور مصالحت جیسی چیزیں ان کے ہاں سرے سے ہی ناپید ہیں۔ وہ زندگی کو واضح اور سچے انداز میں دیکھتے ہیں۔ انہیں کسی بھی قسم کا خوف لاحق نہیں، اس لیے ان کی نظمیں سناں کی نوک پر بھی سچ کہتی ہیں۔ فراز ناقابلِ برداشت حد تک سچائی کے قائل ہیں۔ لگی لپٹی رکھنا اور بات کو ملفوف انداز میں کہنا ان کا

مسلک ہے نہ فنی وسیلہ۔ ان کی ایک نظم نئی مسافت کا عہد نامہ دیکھیے:

مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
جو میرے دیوار و در سے ٹپکا
تو شاہراہوں تک آ گیا تھا
جہاں کسی کو گماں نہیں تھا
مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
مرے مقدر میں آبرو
کی تمام لمبی مسافتیں تھیں
مرے سفر میں
حسین کے سر، مسیح کے جسم
کی سبھی دردناکیاں تھیں، اذیتیں تھیں
مگر مرا دور بے وقر تھا
مگر مرا دشت بے شجر تھا
یہ بات برسوں کی ہے...... تو ہو
پر وہ ساعتیں اب بھی نوحہ گر ہیں
جہاں کہیں بھی ہجوم ہوتا
تو سب مری سمت دیکھتے
اور طنز کرتے
کہ اس کو دیکھو
یہ کون پیکر ہے
جس کا چہرہ نہیں
میں اُن سے کہتا
کہ میں تمہی میں سے ہوں
یہ دیکھو
یہ میری مٹی یہ میری دنیا یہ خواب میرے
وہ مجھ سے کہتے
کہ تیری مٹی کو تیری دنیا کو تیرے خوابوں کو کون دیکھے

کہ تیری آنکھیں نہیں
میں ان سے کہتا کہ
میرے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں صداقتوں کی، رفاقتوں کی
وہ مجھ سے کہتے
بدن تو دیوار کا بھی ہوتا ہے
ہاتھ اشجار کے بھی ہوتے ہیں
جس کی شاخوں کی نوک پر
صرف ایک پتا لرزتا رہتا ہے
پر وہ دیوار اور وہ اشجار ہم نہیں ہیں
میں ان سے کہتا
کہ مجھ کو دیکھو
نہ میری گردن میں طوق ہے
اور نہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں
مگر وہ کہتے
بہت سے محکوم بے رسن ہیں
کہ دست و پا کی کشادگی کا عذاب
حیواں بھی جھیلتے ہیں
پر اُن کے ماتھوں کی لوح پر
کوئی نام کندہ
نہ اُن کے چہروں پر
عہد نامہ کوئی رقم ہے
یہ عہد نامہ
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہے ثبات بھی ہے
میں نسلِ آدم کے اس قبیلے کا فرد تھا
پر کوئی مجھے جانتا نہیں تھا
میں اپنے ایثار کے فسانے انہیں سناتا

مگر کوئی مانتا نہیں تھا
ہم ایک جیسے تھے
پر گروہِ الم کشاں میں
کوئی بھی اک دوسرے کو پہچانتا نہیں تھا
کہ سب کے چہرے تھے سب کے ماتھے تھے
اور ماتھوں پہ
عہدنامے لکھے ہوئے تھے
محبتوں کے صداقتوں کے
سفر کی ساری رفاقتوں کے
بیافرا کی پہاڑیوں
ویت نام کے جنگلوں
کربلا کی قیامتوں کے
تمام پیکر تمام چہرے تھے
آئینے ان علامتوں کے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہیں، ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں
میں سر بریدہ پلٹ کے آیا
تو ساتھ سارے نشان لایا
اَنا کے
پندار کے
وفا کے
مرا لہو ندیوں کی صورت بہا تو قلزم بنا گیا ہے
مرا لہو پھیل کر
مری خوش نہاد مٹی کی سرحدوں کو بچا گیا ہے
وہ میرے چہرے پہ ایسی آنکھیں لگا گیا ہے
جو دوسروں سے عظیم تر ہیں
جو سب کی نظروں میں معتبر ہیں

وہ زندگی کا ثبوت بھی ہیں ثبات بھی ہیں
جوذات بھی کائنات بھی ہیں

آپ نے نئی مسافت کا عہد نامہ دیکھا جس میں لہو کی سرخروئی کا ذکر ہے۔شاعر نے اپنے عہدِ گزشتہ کو عہدِ موجود بنا کر پیش کیا ہے۔ بے چہرہ لوگوں کی بے کردار زندگی پر طنز ہے۔یہ نظم بھی گزشتہ کا المیہ ہے۔شاعر نے اس نظم میں بھی فکر و احساس کی نئی جہتیں اور درِ وا کیے ہیں۔عہد نامے گم ہو رہے ہیں، بے عہدی اپنے پورے وجود کے ساتھ تختِ امروز پر جلوہ گر ہے۔جو کچھ بچ گیا ہے وہ شاعر کے ایثارِ قلم اور فشارِ لہو کے سبب سے ہے مگر اس سارے عمل میں فراز انسان میں محبت اور امن کے زاویے تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔وہ بنیادی طور پر محبت اور انسانیت ہی کا شاعر ہے، جیسا کہ نجم الحسن رضوی نے بھی کہا ہے:

"فراز کے یہاں غزل اور نظم دونوں میں انسان سے زیادہ انسانیت سے محبت کا جذبہ ملتا ہے اور جب وہ انسانیت کو خطرے میں پاتے ہیں تو ان کے اندر کا عاشق پرانے زمانے کے عاشقوں کی طرح صرف آہ و بکا ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ہر ظلم و ناانصافی کے خلاف نعرۂ احتجاج بھی بلند کرتا ہے۔سب جانتے ہیں کہ شاعری میں فراز کا سلسلۂ کتاب ان شاعروں سے ملتا ہے جو ساری زندگی اپنے تیشۂ فن سے زندگی کے کوہِ گراں سے مقصد و معنی کی جوئے شیر لانے کی کوشش کرتے رہے۔فراز کی شاعری بھی چوتھی کھونٹ یعنی پابند علاقوں کا سفر ہے،اس راستے میں بڑی کٹھن منزلیں آتی ہیں اور جبر کے جادو سے آدمی پتھر بن جاتا ہے، واپسی کا راستہ نہیں ملتا مگر فراز اس جنگل میں اپنا راستہ کھو کے خوش ہوتے ہیں اور کسی مصیبت سے نہیں گھبراتے۔دیدہ و نادیدہ بلاؤں سے نبرد آزما ہونے کے لیے فراز کی شعری نیام میں دو تلواریں ہیں نظم و غزل، جن کو وہ حسبِ ضرورت استعمال میں لاتے ہیں۔ان کی نظمیں اب کس کا جشن مناتے ہو'سحر کے سورج' کہا نہیں تھا، میں تیرا قاتل ہوں، میری ہجرت، عفریت، ہواؤں کی بشارت، مت قتل کرو، محاصرہ اور واپسی وغیرہ قومی معاملات میں ان کے زاویۂ نگاہ کو پوری شدت سے پیش کرتی ہیں اور ان کے نظریۂ فن کی تشریح بھی۔"

اب فراز کی ایک ایسی نظم دیکھتے ہیں جو کسی زمانے میں انہیں خود بھی پسند رہی ہے۔ان کی اس نظم "واپسی" میں بھی فراق و وصل کی ہلکی سی کسک موجود ہے۔شاعر نے کس فنی باریکی سے اپنے المیے کو زمانے کا المیہ بنایا ہے اور اس المیے سے امید کا چراغ روشن کیا ہے۔آیئے ان کی نظم واپسی دیکھتے ہیں:

اُس نے کہا

سُن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے لَوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
اور دریا دریا پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں ڈوبو
جس دل میں بھی اُترو
میری طلب آواز نہ دے گی
لیکن جب میری چاہت
اور میری خواہش کی لَو
اتنی تیز اور اتنی
اونچی ہو جائے
جب دل رو دے
تب لَوٹ آنا

احمد فراز نے اپنی نظموں میں جا بجا قلم کی سرخروئی کا ذکر کیا ہے۔ اُسے اپنے قلم کی سرخروئی پر ناز بھی ہے۔ یہ شاعرانہ دیانت ہے جو شاعر کو اعتماد عطا کرتی ہے اُسے یہ زعم ہے کہ وہ جو تھا اُس نے وہی لکھا۔ حرف کو آبرو دی اور زندگی کو عظمت اور سرفرازی دی۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''قلم سرخرو'' ہے دیکھتے ہیں:

قلم سرخرو ہے
کہ جو اُس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تُو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہوں
تو بازو سناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں

تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے جو
ظلم کے موسموں میں
کھلے آسمانوں تلے
اِس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مَس سے
سکوتِ زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بُو ہے
قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا
وہ بازو
جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر

بے کفن اُن کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرا لیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لبِ معموں کی ثنا میں لگے تھے
اب اُن کی ثنا چار سُو ہے
قلم سرخرو ہے

اور پھر وہ لمحہ بھی آتا ہے جب ہم دولخت ہو جاتے ہیں۔ دھوپ ہمارے آنگن میں ہجر کی دیوار کھینچ دیتی ہے۔ ہم آدھے رہ جاتے ہیں۔ ایسے سے وقت نہیں رُکتا لہو کی گردش رُک جاتی ہے۔ شاعر جو سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے، اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اُس نے اس المیے کو کس طرح دیکھا ہو گا۔ ایسا المیہ جب وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور آئینے کرچی کرچی ہو جائیں۔ ایسے میں ان کی نظم سحر کے سورج ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے:

سحر کے سورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہولہو ہے
وہ میرا مشرق
جو میرا بازو ہے میرا دل ہے مری نمو ہے
جو میرے اطراف کا نشاں
میری آبرو ہے
لہولہو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں

کیا ہُوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاعوں کا نُور اندھیروں میں گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے

سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں
یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں
سحر کے سورج
ستم کی آندھی رُکے
تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
سسک سکوں گا
لہو کی بارش تھمے
تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جانکنی کے دُہرے عذاب میں ہوں
جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج
مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں

جو گھر سے نکلے تھے سر اٹھائے قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہِ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لیے
بے شمار بازو علم اٹھائے
رواں ہوئے تھے یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پر نہ حرف آئے
سحر کے سورج
مری نظر میں انہی رفیقوں کے قافلے ہیں
کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ
کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں
جو پا بہ زنجیر
منفعل گردنیں جھکائے
عدو کے نرغے میں
ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں
جہاں حقارت کے طعن
نفرت کے سنگ
رسوائیوں کے بازار
منتظر ہیں
سحر کے سورج
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تُو نہ دیکھے
یہ جاں نثاروں شہید یاروں کا چھچھاتا لہو نہ دیکھے
یہ میں نہ دیکھوں

یہ تُو نہ دیکھے

شاعر ظلم کے خلاف ہے اور صرف اپنی سرزمین پر نہیں بل کہ جہاں جہاں ظلم دیکھتا ہے، اُس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ فلسطین کے جلتے مناظر ہوں یا کشمیر میں کشت و خون کا بازار، بیروت ہو یا ویت نام شاعر ہر ظلم پر نوحہ کناں ہے۔ مگر اس نوحے میں جذبہ بھی ہے اور ستم گر سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب بھی۔ ہمارا یہ شاعر ایک عالمی سوچ رکھتا ہے اور بے ضمیروں کے خلاف قلم کا جہاد کرتا ہے۔ یہی فکر ان کی نظم ویت نام میں بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کا دامان و آستیں
خونِ بے گناہاں سے تر بتر ہے
تو نسلِ آدم
وفورِ نفرت سے رُوئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذب جہاں کی مخلوق
کل ترے رُوبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہہِ تیغ کر رہا تھا
تو تُو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ براں میں

اور تری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم بھی کیا جواب دیں گے

ڈاکٹر سیّد حسن عباس نے ایک جگہ فراز کی چند نظموں کا احاطہ کیا ہے۔ یہاں ہم ان کی رائے اور فراز کی نظم ''خواب مرتے'' نہیں درج کرتے ہیں:

''احمد فراز جدید دور کے صفِ اول کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام ''جاناں جاناں'' اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ میں نے اس کے مطالعے کے دوران خاص طور پر اس میں شامل نظموں کو خصوصیت کے ساتھ اہمیت دی کیوں کہ آج ہمیں جدید نظم کے نام پر ایسی بہت کم نظمیں مطالعے کے لیے مل سکیں گی، جیسی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ہر نظم ایک خاص موضوع پر ہونے کے ساتھ نہایت صاف اور ستھرے انداز میں مسئلے کو بیان کرتی ہے اور قاری کے فہم و ادراک کے سانچے پر بھی گراں نہیں گزرتی۔

نظم ''خواب مرتے نہیں'' عمیق فکر کی اچھی عکاسی ہے۔ اس کی ایک اور سطح فراز کی نظم ''مت سوچو'' میں ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ نظم اس وجہ سے قابلِ مطالعہ ہے کہ اس میں احمد فراز نے نہایت غیر جانبداری کے ساتھ سماجی طبقہ بندی کی طرف اشارے کیے ہیں اور دونوں طبقات سے الگ ہٹ کر اس فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

تم بھی کیا لوگ ہو
پردیس بھی آتے ہو
تو لے آتے ہو
بیمار شب و روز و دل افگار
عزیزان وطن کی یادیں
اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح
جن کے دھبوں کو تو
خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں

اس نظم کے بعد جب ہم نظم ''اب کس کا جشن مناتے ہو'' پڑھتے ہیں تو وہ مایوسی و ناامیدی یہاں طنز کا روپ دھار لیتی ہے، جو نظم ''مت سوچو'' کے ایک مصرعے میں محسوس ہوتی ہے یہ نظم یعنی ''اب

کس کا جشن مناتے ہو" ایک ایسا کُل پیش کرتی ہے جس کے ٹکڑے ٹکڑے پوری نظم میں بکھیر دیے ہیں۔ وطن پرستی، دوستی ایثار، قربانی، غم خواری، ہمدردی و دم سازی.... بل کہ پوری انسانیت کا جامہ اس نظم میں شاعر کے آنسوؤں سے دُھلتا جاتا ہے اور جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے، دکھ کا یہ احساس اور بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔

اور اب دیکھیے نظم "خواب مرتے نہیں":

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھُکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نُور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں

احمد فراز نے ٹھیک ہی کہا ہے، خواب کبھی نہیں مرتے بل کہ ہر شب نئے انداز کے ساتھ آنکھ کے پردے پر جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ خوابوں کی کوئی سرحد ہے نہ علاقہ، وہ تو جس دل میں چاہیں قیام کریں جس آنکھ میں چاہیں خیمہ زن ہو جائیں۔ فراز کی نظمیں انہی خوابوں اور تعبیروں سے عبارت ہیں جو زندگی کو جہدِ مسلسل، امن، محبت اور انسانیت کی راہ پر چلاتے ہیں۔ یہ صرف خوابوں کے شاعر نہیں بل کہ عملی طور پر بھی زندگی کے نامساعد حالات سے نبرد آزما رہتے ہیں اور ستم کے آگے علَمِ جہاد بلند کرتے ہیں۔ فراز کی نظمیں زبان و بیان کے شہ پارے ہیں پہاڑی ندیوں کی طرح پُر جوش برق رفتار اور گنگناتی گاتی ہوئی نہ ٹھہریں نہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑیں، ہر لحظہ پر اعتماد اور پُر امید زندگی کی دلکشی کی آئینہ دار ان کی ایک نظم کشاں بی بی دیکھیے اور شاعری کا لطف اٹھایئے:

تو جب
بمبر یت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی جسم شل
اعضا تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان..... بے حس تھے
سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
رُوحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں یکجا ہیں
ضیا، باسط، سعید اور میں
ہمارا میزباں کب سے نہ جانے
گھر کے دروازے کھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا
ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اِس وادی میں آئیں گے
چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُر کی خوشبوؤں سے
چُور بوجھل

طائرانِ خوشنما و خوش نوا..... بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم و یاقوت سا چھل بل
ادھر کچھ دور بُزغالوں کے گلے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا..... سحر آفریں دنیا
''مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را''
ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر
ہم خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ میں دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
کبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جُھباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پا کوباں
دف ودمامہ ومردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے..... مجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اُٹھیں
کبھی غارت گرِ تمکین وہوش ودشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
گروہ در گروہ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
کشاں بی بی
قد وقامت قیامت
جُنبشیں جادو
بدن طوفاں
ضیا کردار میں گوتم
مجسم صدق وایثار ووفا
درد آشنا ونفس کش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہردم
قلم اس کا دُرافشان و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں
یہاں دنیا کے غم بھولا ہوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں
سعید اک کم نظر جذبات کا پتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
میں بُت

کشاں بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل
لذتِ معنی سے نامحرم
زبانِ یار کیلاشی و ما از حرفِ بیگانہ
(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشاں بی بی یہ کہتی ہے
"مرے محبوب تُو اک دستۂ مُر ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اُس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنین
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی چکوری
تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے

آ مرے ہمراہ چل پیاری

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پرسحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تِل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرہ
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی
ضیا گوتم سہی
لیکن کشاں بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشاں بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رُخصت ہوئی ہم سے
بصد انداز استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

فراز صاحب کی چند اور نظموں کے اقتباس دیکھیے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کی نظمیں اُن کے شعر پڑھنے یا سننے والے کے ادراک پر کبھی بوجھ نہیں بنتے ۔

کون اس قتل گہہ ناز کو سمجھے اصرار
جس نے ہر دشت کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن

نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور اُدھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

(سلامتی کونسل)

یہ کون معصوم ہیں
کہ جن کو
سیاہ آندھی
دیے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انہیں کون جانتا نہیں ہے
یہ کس قبیلے کے سر بکف جاں نثار ہیں
کہ جن کو کوئی پچھاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحان ہے
نہ کوئی بچہ، نہ کوئی بابا، نہ کوئی ماں ہے
محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ
بادشاہ چپ ہے
حرم کے سب پاسباں
عالم پناہ چپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے
سربراہ چپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے
لاالٰہ چُپ ہیں

(بیروت)

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کے دامان و آستیں

خونِ بے گناہوں سے تر بتر ہے
تو نسلِ آدم
وفورِ نفرت سے روئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذب جہاں کی مخلوق
کل ترے روبرو یہی بے ضمیر قاتل
ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہِ تیغ کر رہا تھا
تو تُو تماشاہیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغ براں میں
اور تیری مصلحت کے تیروں میں
فرق کیا ہے؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے

(ویتنام)

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے
اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب تیرے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی میں
کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

(یہ میری نظمیں یہ میری غزلیں)

آخر میں فراز کی نظم کے حوالے سے محمد احمد سبزواری کی رائے دیکھتے ہیں:

''فراز کی نظموں میں مضامین کے ساتھ اسالیب کا تنوع بھی خوب ملتا ہے اگر ایک طرف ''ممدوح'' ایسی فیضان و عرفان محبت سے سرشار نظم اس مجموعہ میں شامل ہے تو یہ دوسری طرف شہدائے جنگِ آزادی کے نام ایسی سیاسی شعور سے بھرپور نظم بھی اس میں موجود ہے۔ادھر ''شاخِ نہالِ غم'' اگر شاعر کے سوانح کا ایک باب ہے تو ادھر ادب اور ادیبوں سے اس کا سوال ''فراق کی تصویر دیکھ کر''، ''غریب شہر کے نام'' اور ''پیمبرِ مشرق'' ایسی مکمل نظموں سے ظاہر ہے۔پھر یہ نظمیں سب ایک ہی اسلوب کی اسیر نہیں ہیں، ان میں آزاد معریٰ اور پابند تینوں اسالیب کو موضوع اور موڈ کی مناسبت سے برتا گیا ہے۔ان اسالیب کی جداگانہ تکنیک پر یکساں عبور حاصل کرنا بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے، فراز نے یہ کارنامہ جس آسانی اور عمدگی سے انجام دیا ہے آنے والے صفحات اس ثبوت کے لیے کافی ہیں اور ان کی فنکارانہ پختگی کا بھی پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ن۔م۔راشد اور میرا جی کی تخلیقات کے علاوہ اکثر آزاد نظمیں جواب تک لکھی گئی ہیں، اردو کے مزاج کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ان میں لکھنے اور پڑھنے

والے کے درمیان بلاواسطہ افہام وتفہیم کا وہ سلسلہ پورے طور پر قائم نہیں ہو پاتا جو فن کا مقصود بھی ہے اور معراج بھی۔ ممکن ہے اس میں پڑھنے والے کا بھی تھوڑا بہت قصور ہو کہ وہ اردو میں غزل کی مسلسل مطلق العنان حکمرانی کے باعث نہ بدلنے والی بحر بار بار دہرائے جانے والی ردیف اور ایک ہی صورت کی تکرار کیے جانے والے قوافی کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ وہ آزاد نظم نگار کے مفہوم و عمل کے خلاف اپنے ذہن میں تعصب کی دیواریں کھڑی کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ذہن پر ذرا بھی بوجھ ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اب تک دو تین لکھنے والے ہی اس اسلوب کو اپنا سکے ہیں باقی شعرا کے ہاں نہ کوئی اتنا شدید جذبہ، گہری سوچ، مخلص فکر، اچھوتا تجربہ ہوتا ہے جو پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہا لے جا سکے اور اس نظم کے مطالعہ کے دوران اس کے تنقیدی شعور کو یقین کی تھپکیاں دے کر سلا سکے نہ یہ حضرات ردیف وقوافی کے نقصان کی کسی اور طریقہ سے مثلاً نادر تشبیہات جدید لیکن مانوس تراکیب، نوایجاد استعارات، مصرعوں کی نغمگی اور چھوٹے بڑے مصرعوں میں یہاں وہاں قوافی ردیف کے از خود استعمال ہو جانے کے ذریعہ تلافی کر پاتے ہیں حالاں کہ اردو میں آزاد نظم کی بقا اور مقبولیت کے لیے یہ از حد ضروری ہے کہ نظم نگار الفاظ و اصوات کا ایسا فنکارانہ استعمال کریں کہ پوری نظم میں انفرادی آہنگ اور ایک مخصوص نغمہ پرور فضا قائم رہے۔ یہ ہماری آزاد نظموں میں ناپید ہے۔

فراز کی آزاد نظمیں ان تمام اسقام سے پاک ہیں مثال کے طور پر "پیغمبر" ہی کو لیجیے یہ اپنے موضوع کے پھیلاؤ اور اہمیت انداز بیان اور موضوع کی ہم آہنگی جتنے بھی اس میں بند ہیں، اس کے باہمی ربط اور تعمیری ارتقا اور پھر اپنے خاتمہ کے فیصلہ کن لہجہ کے اعتبار سے عظیم ہے اور فراز کی اب تک کی تخلیقات میں غالباً ان کا شاہکار بھی۔ اس میں انہوں نے ایشیا کی پست اقوام کی زبوں حالی کے اسباب وعلل کا فنکارانہ جائزہ لیا ہے اور ان کے درد کا ایک ایسا درماں بھی تجویز کیا ہے، جو ان کے اپنے قبضۂ قدرت میں ہے۔"

احمد فراز کے ڈرامے

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ریڈیو کی آواز اپنے عروج پر تھی ۔ان دنوں طویل ڈرامے پیش کیے جاتے تھے اور بعض اوقات اُسی وقت لکھے اور نشر کیے جاتے تھے ۔لیکن یہ سب ڈرامے نثر میں ہوتے تھے ۔فراز نے ان دنوں منظوم ڈرامے لکھنے شروع کیے جن میں ایک ڈرامہ سپاہی اور موت بھی تھا جس میں خود فراز صاحب نے بھی صدا کاری کی تھی ۔اس ڈرامے میں کل چار کردار ہیں زخمی سپاہی ، پہلا سپاہی ، دوسرا سپاہی اور موت ۔اس ڈرامے کا مرکزی خیال ترادوسکی سے لیا گیا ہے ۔یہ ڈرامہ زندگی اور موت کے درمیان کشمکش پر مبنی ہے، آخر موت ہار جاتی ہے اور زندگی ظفریاب ہوتی ہے ۔لیکن اس ڈرامے کا خیال، پلاٹ اور کردار اتنے جاندار ہیں کہ مدتوں بھلائے نہ جا سکیں ۔ڈرامہ نگار نے نظم کے قواعد وضوابط کی پابندی کے باوجود کہیں کسی لائن میں جھول نہیں آنے دیا ۔حیرت آخر تک برقرار رہی ہے ۔ڈرامہ پرت در پرت کھلتا ہے کچھ اس طرح کہ سننے والا اس میں ڈوبتا چلا جاتا ہے ۔یہ ایک طویل ڈرامہ ہے جو شب خون میں شامل ہے ۔اس کا کچھ حصہ پیش کرتے ہیں:

موت: زمیں جل چکی ہے

سپاہی: میں پہلے بھی ویران خطوں کو زرخیزیاں دے چکا ہوں

موت: مگر اب یہ ممکن نہیں ہے
کہ پانی کے چشمے کنویں اور نہریں
بموں کی لگاتار بارش سے اب خشک اور بے نشاں ہو چکے ہیں
درانتی ۔ہتھوڑے ۔سلاخیں ۔کدالوں کے پھل اور
ہل ۔گویا سب تیرے اوزار ۔ہتھیار ٹوٹ کر چکے ہیں

سپاہی: مگر تا بکے
میں سپاہی ہوں
گر بخت نے یاوری کی
اور اک بار میرے قدم

اپنے شہروں میں پہنچے
تو پھر
یہ مسمار گھر
منہدم کارخانے
جلی کھیتیاں
اور خاموش بازار
یوں جی اُٹھیں گے
کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا

موت: بجا
پر یہ اُس وقت ممکن ہے

سپاہی: لیکن ......

موت: ٹھہر تو مری بات سن
یہ تو اُس وقت ممکن ہے جب
ترے بازو سلامت ہوں اور جسم کا کوئی حصہ نہ بیکار ہو
مگر ایسے عالم میں بھی
تیری خوش فہمیاں تجھ کو بہکا رہی ہیں
ہلاکت کی آندھی ترے جسم کا ریزہ ریزہ اُڑانے کو پر تولتی ہے
ابھی وقت ہے سوچ لے

سپاہی: (ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنے آپ سے) تو کیا کوئی قوت بھی
ایسی نہیں ہے
کہ جو موت کے زعم و پندار کو چُور کر دے
کوئی ایسی صورت نہیں
جس سے میں قلعۂ مرگ کو منہدم کر سکوں
نہیں..... آج تک موت پر کس کو قدرت ملی
اگر یونہی ہوتا رہا ہے
تو پھر کیوں نہ میں خود کو اس کے حوالے ہی کر دوں
کشاکش کا حاصل؟

فقط نزع کا طول۔ اور پھر
ہزیمت شکستِ نفس
(موت کی طرف دیکھتے ہوئے)
موت!
میں صرف اک شرط پر زندگی کی متاعِ گراں تیرے قبضے میں
دینے کو تیار ہوں

موت: شرط!
(قہقہہ لگاتی ہے)
بھلا موت سے بھی کسی نے کوئی شرط منوائی ہے؟

سپاہی: جانتا ہوں کہ میں
دوسروں سے کسی طرح بہتر نہیں ہوں
اگر آج تک کوئی تجھ سے نہ جیتا
مگر دشمنِ زندگی
صرف اک شرط پر

موت: کون سی شرط؟

سپاہی: بس یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو تو اک روز کے واسطے تو مجھے چھوڑ
دے گی
بس اک روز کے واسطے
تا کہ میں اپنے غازی رفیقوں کی صف میں کھڑا
فتح کے گیت گاؤں

اسی طرح ان کی کتاب ''میرے خواب ریزہ ریزہ'' بھی چار ڈراموں پر مشتمل ہے۔ یہ منظوم ڈرامے روشنیوں کا شہر، ساحل کی ریت، موم کے پتھر اور آخرِ شب کے ہم سفر سب کے سب ریڈیو کے لیے لکھے گئے تھے۔ روشنیوں کا شہر چھ منظروں پر مشتمل ہے اور ہر منظر دعوتِ شنیدن دیتا ہے۔ ساحل کی ریت ایک مختصر ڈرامہ ہے جس میں سلیمان، ہمزاد، نبیلہ، خاتون اور آواز جیسے کرداروں نے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ موم کے پتھر میں بوڑھا فریدوں، عالیہ اور سیاح مرکزی کردار ہیں۔ اس ڈرامے کا آخری حصہ دیکھیے:

فریدوں: چلو......اس کی مرضی

عالیہ: مگر جانے ابو کو کیا ہو گیا ہے
وہ اس پر مصر ہیں کہ سیاح کچھ روز تک اور ٹھہرے
فریدوں: مگر کیوں؟
عالیہ: نہ معلوم کیوں..... شاید ابو کو اُس کی خوش آہنگ و دلچسپ باتیں
پسند آ گئی ہیں.... اسی واسطے .....
فریدوں: ہاں کہو
عالیہ: کچھ نہیں
فریدوں: ہاں اسی واسطے؟
عالیہ: وہ اُسے مستقل طور پر اپنے یاں ....
فریدوں: عالیہ!
عالیہ: مجھ کو احساس ہے
پر یہ ہونا ہے
ابو یہی چاہتے ہیں
مجھے یاں بلانے سے ان کا یہی مدّعا تھا
کہ میں اُن کی خواہش کی تائید کر دوں
فریدوں: تو گویا تمہیں بھی .....
عالیہ: فریدوں! تمہیں شاید اُس شام کی گفتگو یاد ہو
میں نے جب بحث کی آڑ میں اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا
مگر پھر بھی ابو نہ سمجھے
نہ سمجھے کہ وہ بس وہی چاہتے ہیں..... جو وہ چاہتے ہیں
فریدوں: مگر تم
عالیہ: اگر اُن کی سب زندگی صرف میرے لیے
ایک صحرا کی مانند ویراں رہی
ان کی سب خواہشیں، آرزوئیں مری پرورش
میری خوشیوں کی خاطر شب و روز پامال ہوتی رہی ہیں
تو میں کس طرح .... کس طرح
صرف اپنے لیے..... اپنے معیارِ ذہن و نظر کے لیے

اُن کے دکھ بھول جاؤں

فریدوں: مگر میرے دُکھ عالیہ، میرے دُکھ

عالیہ: تم فسردہ نہ ہو

فریدوں: جیسے میں جاں سے عاری ہوں پتھر ہوں بے حس ہوں
میری کوئی آرزو کوئی خواہش نہیں
پتھروں پر بھی تیشہ پڑے تو صدائیں نکلتی ہیں
چنگاریاں پھوٹتی ہیں

عالیہ: مگر تم تو شاعر ہو شاعر..... عظیم اور برتر
جو خود اپنے ناسور دل میں چھپائے ہوئے
دوسروں کے لیے راحتیں ڈھونڈتا ہے
مسیحا تر افن تو اوروں کو جاں بخشتا
اور خود درد کی دار پر جھولتا ہے
اگر اس جہاں میں سبھی خود غرض ہوں
اگر ہر کوئی اپنے دکھ کو سنبھالے ہوئے
دوسروں کے غموں اور زخموں سے بے گانہ و بے خبر ہو
تو پھر یہ جہاں اک کھنڈر کی طرح
صرف ماتم کوتر ہے

فریدوں: مگر عالیہ تم بتاؤ
کہ اب میں کہاں ہوں
مری زندگی میری قوت مری روشنی
اب کہاں ہے
یہ دکھ میری رگ رگ میں
اک زہر سا گھول دے گا

عالیہ: تمہارے ہی الفاظ میں
ہم بظاہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں
جاں کا زیاں جانتے ہیں
اِسی دکھ کی شدت

ہمارے شب و روز کے آئینوں کو جلا بخشتی ہے
یہی دکھ اگر جسم کا جز و ہو تو نتیجہ فنا ہے
مگر روح میں رچ سکے تو
اسی تو دۂ خاک کو اک پیمبر بنا دے
پیمبر..... امت' بے کراں، جاوداں
فریدوں: نہ معلوم تم کس بلندی پہ ہو
اور میں کن نشیبوں میں بکھرا پڑا ہوں
مجھے چھوڑ کر تو نہ جا
مرے فن کی خداوند
مرے قلم کی توانائی
میری مرادوں کی منزل
مرے دل کی آواز
عالیہ: پگلے ترا فن تو گملے کا پودا نہیں
جنگلوں اور پہاڑوں کے سینے کا نخلِ توانا ہے
سرسبز پُر تمکنت اور قد آور
جسے برف و باراں کے موسم
نہ وحشت بھری آندھیاں کھا سکیں گی
فریدوں! میں کل جا رہی ہوں
کہاں یہ نہیں جانتی
تم یہ سمجھو کہ میں مر چکی ہوں
فریدوں: مری عالیہ مر چکی ہے!
مری عالیہ مر چکی ہے!!
عالیہ: تری عالیہ مر چکی ہے تری عالیہ
ہاں مگر اک مری آخری التجا ہے
کہ تم اپنے فن کو بلندی کی اُن چوٹیوں تک اُٹھانا
کہ میں جس جگہ ہوں..... تمہیں فخر سے اور محبت سے دیکھوں
ترا فن مری زندگی ہے فریدوں.....فریدوں.....فریدوں

''آخرِ شب کے ہم سفر'' اس کتاب کا آخری ڈرامہ ہے، جس میں سپاہی اور عورت کے درمیان مکالمہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مزید کچھ کہے بغیر یہ ڈرامہ مکمل طور پر یہاں نقل کر دیا جائے لیکن یہ ممکن نہیں دیکھیے ڈرامہ آخرِ شب کے ہم سفر کا کچھ حصہ:

سپاہی: یہ آواز کیسی ہے
جیسے کوئی شدتِ کرب سے رو رہا ہے
مگر اس سمے؟
نصف شب ہو چکی ہے
یہاں کون ہوگا؟
یہاں کوئی ذی روح میرے علاوہ نہیں
اور یہ چند لاشیں
کہ جن کی حفاظت پہ مامور ہوں میں
کوئی زندہ پیکر
یہاں وادیٔ مرگ میں کیا کرے گا
یہ خطہ تو کب سے ہے ویراں
یہاں کچھ شکستہ درو بام
اپنے گزشتہ مکینوں کی یادوں میں
مدت سے یونہی کھڑے ہیں
(پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز)
نہیں یہ مرا واہمہ ہے
یہ شب کتنی ہیبت فزا ہے
کہ میں اپنی آواز سے کانپنے لگ گیا ہوں
(خوفزدہ ہنسی ہنستا ہے)
(دور سے رونے کی آواز پھر ابھرتی ہے)
نہیں واہمہ یہ نہیں
یقیناً کوئی رو رہا ہے
یہ آواز عورت کی ہے
جیسے گھائل پرندے کی زخمی صدا

سننے والے کے دل پر خراشیں لگائے
مگر اس سمے اس جگہ؟
کون ہوگا؟
یہ لاشیں مرے سامنے پتھروں کی طرح سرد و بے حس پڑی ہیں
یہ لاشیں مرے ملک کے دشمنوں کی
اور ان کی حفاظت کو میں ہوں
فقط میں
کوئی نوحہ گر ہے نہ ماتم سرا ہے
تو پھر یہ صدا بین کی
یہ جگر سوز فریاد کس کی ہے؟
کیسی ہے؟
کیوں ہے؟
یہاں تو بجز ایک معبد
کوئی بھی عمارت سلامت نہیں ہے
تو جیسے اسی میں کوئی ہے
عبادت کا یہ وقت؟
(سسکی)
لیکن نہیں
یہ تو رونے کی آواز ہے
اور وہ بھی کسی اپسرا کی
چلوں جا کے دیکھوں
مگر شام تک تو
وہاں بھی
فقط چند بے نور شمعیں
شکستہ ظروف
اور مرجھائے پھولوں کی ویران خوشبو تھی
آواز کوئی نہیں تھی

فقط خامشی اور اندھیرا
یہاں تک کہ معبد کی سہمی ہوئی گھنٹیاں
بے صدا ہو چکی تھیں
تو پھر اس سے کون ہے؟
سحر ہے
یا مرا واہمہ
کیا خبر
کوئی آسیب ہو
کوئی بد روح
جو اپنے پیکر کی فرقت میں
نالہ کناں ہو
مگر میں سپاہی ہوں
ان واہموں سے مجھے کیا تعلق
میں بُزدل نہیں
خواہ کچھ بھی ہو
میں اس جنونِ فغاں کا تعاقب کروں گا
(پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی آواز)
(قدموں کی چاپ اور سسکیاں اُبھرتی ہیں)

آواز نمبر۱: (ہش) سُنو!
نمبر۲: جیسے کوئی ادھر آ رہا ہے
نمبر۱: چلو اب اُٹھو ورنہ ہم بھی نہیں بچ سکیں گے
نمبر۲: بھلا مرنے والے کبھی آہ و زاری سے زندہ ہوئے ہیں
یہاں تک پہنچنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا
مگر ہم تری دکھ بھری التجا پر یہ تابوت، پرچھائیوں کی طرح
رینگتے رینگتے اس جگہ لے کے آئے ہیں
یہاں اب گھڑی دو گھڑی کا توقف کھلی خودکشی ہے
یہ سارا علاقہ تو اب دشمنوں کے تسلط میں ہے

ورنہ معبد بھی

اُٹھو چلو

(بھاری قدموں کی آواز ہر لحظہ معبد کی دہلیز کی سمت

بڑھتی چلی آرہی ہے..... سسکیاں بڑھ جاتی ہیں)

تمھیں اس جواں مرگ شوہر کے غم کی قسم اب اُٹھو

نمبر۲: چلو ہم چلیں دوسرے راستے سے نکل جائیں ورنہ .....

نمبر ا: سنو پاؤں کی چاپ ادھر ہی کو بڑھتی چلی آرہی ہے

(آواز بڑھتی چلی آرہی ہے ۔سسکیاں جاری ہیں۔

دونوں کرداروں کے قدموں کی

چاپ اُبھر کر غائب ہو جاتی ہے ۔بھاری قدموں کی

چاپ رُک جاتی ہے)

سپاہی: کون ہے؟

(سسکیاں)

کون ہے؟

(سسکیاں)

(قدموں کی آواز قریب آکر رُک جاتی ہے)

بتا کون ہے تو

بتا ورنہ تیرے لیے میرے پستول کی ایک گولی بھی کافی رہے گی

(سسکیاں)

(پستول بھرنے کی آواز)

(خود کلامی کے انداز میں)

نہیں اتنی جلدی نہیں چاہیے

ذرا روشنی میں اُسے دیکھ لوں

عورت: تو رُک کیوں گئے مار ڈالو مجھے بھی، مجھے بھی،

مجھے زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے

نہ مرنے کا غم ہے

نہ جینے کی خواہش

(سسکیاں)

سپاہی: مگر تو یہاں اس سمے
ایک ویران معبد میں کیوں رو رہی ہے
تجھے یہ خبر ہے کہ اب اس علاقے پہ دشمن کا قبضہ ہے
اور کوئی کچھ بھی نہیں جانتا
اس کا انجام کیا ہو
اور پھر تم تو عورت ہو
میں.....اس لیے

عورت: قتل کرنے سے گھبرا رہا ہوں
یہی کہنے والے ہو تم
میرے شوہر کے قاتل
مجھے زندہ رہنے کا لالچ نہیں ہے
یہ تابوت جو میرے خوابوں کا مدفن ہے
میرے جوانمرگ شوہر کے لاشے کا مسکن ہے
اس کو مرے خون کے سرخ پھولوں سے گلنار کر دے
کہ یہ ظلم احسان ہو گا

سپاہی: مگر میں نہیں تیرے شوہر کا قاتل
نہ میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہ تابوت کس کا ہے
میں تو فقط تیرے رونے کی آواز سن کر ادھر آ گیا تھا

عورت: اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہو گا
کہ قاتل تو سب ایک ہیں
ایک سے ہیں
مجھے اس سے کیا
کس کے خنجر سے گھائل ہوئی ہوں
مجھے اس سے کیا
کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھونک ڈالا
وہ خنجر ترا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو

میں تو گھائل ہوئی
آگ تو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
مرا آشیاں تو جلا

بودلک ایک طویل منظوم ڈرامے پر مشتمل کتاب ہے اس ڈرامے کے کرداروں میں بودلک۔ وادی کا مضبوط بیٹا، قلش۔بودلک کا فلسفی دوست، ژگولہ۔بودلک کی منتخب دلہن، پیردانا۔وادی کا روحانی بزرگ، پہلا بڑا، دوسرا بڑا اور تیسرا بڑا شامل ہیں جو وادی کے اکابرین میں شمار ہوتے ہیں۔ڈرامے پر بات کرنے سے پہلے اس ڈرامے کے بارے میں خود احمد فراز کی رائے دیکھتے ہیں:

''بہت پہلے میں نے ایک افریقی ادیب (اب اس کا نام یاد نہیں) کا ایک کھیل The Oda Oak پڑھا تھا۔ مجھے یہ بہت پسند آیا اور میں نے چاہا کہ اسے اردو نظم میں منتقل کر دوں۔تھوڑا بہت آغاز بھی کیا مگر پھر کتاب کہیں ادھر ادھر ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے ریڈیو پاکستان پشاور کے ڈائریکٹر جنرل جناب سجاد حیدر صاحب نے کہا کہ میں چترال جاؤں اور وہاں کافرستان وادی کے لوگوں کی بود وباش کے بارے میں کچھ مواد اکٹھا کروں۔میری مدد کے لیے انہوں نے ایک انجینئر سعید اور ایک پروڈیوسر باسط سلیم صدیقی جو خود بھی ایک ممتاز ڈرامہ نگار ہیں، ہمراہ کر دیے۔ میں نے اپنے طور پر اس قافلے میں اپنے دیرینہ دوست ضیاء الدین ضیاء کو بھی شامل کر لیا اور ہم سرکاری جیپ میں چترال کے سفر پر روانہ ہو گئے۔یہ سفر کچھ تو ہمراہیوں کی وجہ سے اور کچھ ایک نئی دنیا کی دید کے شوق نے کافی Thrilling بنا دیا، ہم وہاں ہفتہ دس دن تک کافرستان کی مختلف وادیوں کیلاش،بمبریت وغیرہ میں گھومتے رہے''کافر''لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج 'زبان' رقص اور موسیقی کے بارے میں مشاہدات جذب اور مواد جمع کرتے رہے۔ یہ سفر بہت ہی زیادہ دلچسپ، معلوماتی اور کہیں کہیں انتہائی خطرناک بھی تھا۔ہم وہاں کی کیلاشی زبان اور دوسری مقامی بولیوں کے لوک گیت اور ان کی دھنیں اس طرح خوشی اور تجسس سے جمع کرتے رہے جیسے مغربی مہم جو افریقہ سے سونا اور قیمتی پتھر لایا کرتے تھے۔بہر طور یہ سفر اپنی جگہ ایک سفرنامہ کا حق رکھتا تھا میرا ارادہ بھی تھا کہ میں کچھ لکھوں لیکن میں نے جو Notes تیار کیے تھے وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئے اور آج تک نہیں ملے۔البتہ ایک شام جس کا پورا تاثر میرے دل و دماغ میں نقش ہو گیا وہ کافر دوشیزاؤں کا رقص

تھااوران کی سرخیل کشاں بی بی کا حسن اور دلفریب شخصیت تھی۔ یہیں مجھے غالب کامصرع بار بار یاد آیا۔

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

چنانچہ پشاور پہنچتے ہی میری پہلی تخلیق کشاں بی بی تھی جو میری کتاب نایافت میں شامل ہے۔ دوسری تخلیق بودلک کا منظوم ڈرامہ ہے جو کافرستان کے بعض روایتی کرداروں اور کچھ افریقی مصنف کے اوڈا اوک (Oda Oak) کا ملغوبہ ہے۔ میں اسے نہ تو ترجمہ کہہ سکتا ہوں اور نہ ہی (Adaptation) جب ریڈیو پاکستان پشاور نے جشن تمثیل کے لیے منظوم کھیل کا تقاضا کیا تو میرے ذہن میں کافرستان کے کردار، وہاں کے رسم و رواج اور محبت و رقابت کے جذبات ابھرنے لگے۔ چنانچہ میں نے یہ منظوم کھیل لکھنا شروع کر دیا۔ کھیل کے آخری حصے تو اس طرح لکھے گئے کہ ادھر ریڈیو پاکستان کا نقل نویس کاغذ اور قلم لیے تیار بیٹھا ہوتا اور ادھر میں منظوم سطروں کی پرچیاں لکھ لکھ کر اس کے حوالے کرتا اور مسودے کی کاپیوں کے بنتے ہی ڈرامہ آرٹسٹ اس کی ریہرسل کرنے لگتے۔ اس عجلت اور افراتفری میں اس منظوم کھیل کی تکمیل ہوئی۔

جب یہ نشر ہوا تو خاصی Controversy چلی۔ بعض لوگوں نے اسے فحش اور قابل ملامت گردانا اور بعض سننے والوں نے اسے تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا"

اس ڈرامے کے کل چار منظر ہیں۔ بودلک اس کا مرکزی کردار ہے۔ ڈرامہ نگار نے انتہائی مہارت کے ساتھ کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ کرداروں کے درمیان کہیں بھی دوری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ سارے کردار پوری ہم آہنگی کے ساتھ چلتے اور بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک اور عجیب بات ان ڈراموں کی شاعری ہے۔ لائنیں اتنی پُراثر اور جاندار ہیں کہ سننے والا ان کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ کرداروں کے لہجے حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک خاص علاقے کی بودوباش کے حوالے سے لکھا گیا ڈرامہ ہے مگر اس میں غضب کا ڈرامائی عنصر پایا جاتا ہے۔ اپنے آغاز سے لے کر انجام تک یہ ڈرامہ پوری ڈرامائی خصوصیات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ کرداروں کے لہجوں کا اتار چڑھاؤ، ان کی زبان، سوچ اور ادائیگی اتنی خالص اور حقیقی ہے کہ اُس پر زندگی کے سارے امکانات صادر آتے ہیں۔ منظوم ڈرامے کی اس مشکل صنف میں احمد فراز نے وہ فنی کمالات دکھائے ہیں کہ انہیں ایک بڑا ڈرامہ نگار ہونے کا اعزاز دیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہمارا شاعر ڈرامہ نگاروں کی صفِ اول میں کھڑا نظر آتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر بڑا ہے یا ڈرامہ نگار۔ آیئے اس ڈرامے کا چوتھے

اور آخری منظر کا کچھ حصہ دیکھتے ہیں:

پیر داتا: فغاں
میں فقط قہر کا ترجماں
اور یہ بودلک ان عقائد کا دشمن
جو ہم نے بزرگوں سے حاصل کیے
توبہ ....توبہ
یہ حد سے بری ساعتیں بھی ہمیں دیکھنی تھیں
کہ باغی بزرگوں کی موجودگی میں
مقدس عقائد کو جھٹلا رہا ہے

پہلا بڑا: میں کہتا ہوں
یہ شخص کوبہ گرفتہ ہے باغی ہے سرکش ہے

تیسرا بڑا: اے پیر داتا غضب ہے
کہ اک ذی شرف
سفلہ و کمتریں ہوگیا

دوسرا بڑا: شرم کر بے حیا شرم کر

دوسرا بڑا: لوگ ادھر بڑھ رہے ہیں
غضبناک اور مشتعل
ان کے نیزوں سے چنگاریاں پھوٹتی ہیں

پہلا بڑا: بڑھے ہی چلے آ رہے ہیں

دوسرا بڑا: قبیلہ چڑھاوے کا خواہاں ہے۔اے پیر داتا

تیسرا بڑا: اجازت کہ یہ مشتعل لوگ
باغی کے ٹکڑے اڑائیں

دوسرا بڑا: اجازت ۔ کہ مُردوں کی منشا کو پورا کریں
اور قبیلے کے سب مرد وزن
اس گنہگار پر بھیڑیوں کی طرح پل پڑیں

پیر داتا: اور ہوائیں یہی کہہ رہی ہیں
کہ تو بودلک

اس غضبناک انبوہ کا سامنا کر
ہمارے قبیلے کے غدار فرزند
میں حکم دیتا ہوں
جا.....اور اس شرم کے لوتھڑے کے لیے
جان پر کھیل جا
(بچہ روتا ہے)

بودلک: رو۔ کہ ہم بدنصیبی کے نخچیر ہیں
روکہ ہم جرم انسانیت کے گنہگار ہیں

پہلا بڑا: اے زمانوں کے ہادی
گناہوں کی حد ہے
کہ یہ بے حیا اپنے آبا کے قانون کا منہ چڑائے

پہلا بڑا: تو کیا.....اے بری ساعتو!
وہ سبھی حکمتیں جو بزرگوں کی برکت سے ہم
سب پہ نازل ہوئیں.....وہ اکارت گئیں
کیا مقدس شجر کی وہ روحیں کہ
جن پر زمانوں کی برکت اتاری گئی
اپنی توہین برداشت کرتی رہیں گی
نہیں۔
اے مقدس پہاڑوں کی پرچھائیو
یہ نہ ہوگا
کہ اپنے عقائد پہ باغی ہنسیں
اور بزرگوں کی وادی میں زندہ رہیں
اپنے آبا کی تقویم خطرے میں ہے
(بچہ روتا ہے)

دوسرا بڑا: پھر سے تاریکیاں چھا گئیں
آسمانوں پہ بادل گرجنے لگے

تیسرا بڑا: پھر سے مجمع میں جنبش ہوئی

پہلا بڑا:	انتقام۔اے مقدس پروہت
قبیلے کے سب مردوزن مشتعل ہو رہے ہیں

بودلک:	مگر اے بڑو
کیا وہ معصومیت کی فغاں
تم نہیں سن سکے
جس نے اونچے پہاڑوں کو دہلا دیا

دوسرا بڑا:	کفر کی انتہا ہے

بودلک:	سو دو
اے اندھیروں کی وادی میں سچ کی اذاں
روکہ برتر صداقت کی آواز
اس خطۂ جدل میں بے ثمر رائیگاں جائے گی
آ کہ اب موت ہی زندگی کی پناہ گاہ ہے
(ہجوم کا شور اور بچے کا بلکنا)
گائے جا
دخترِ امن..... تُو گائے جا
تیری ماں زندگی سونپ کر تجھ کو
خود مر گئی
اور ترا باپ ممنوع سچ کا نشانہ بنا
گائے جا..... دخترِ امن..... تُو
گائے جا..... گائے جا... اے جہالت کی ظلمت میں پہلی
کرن گائے جا..... گائے جا ..... گائے جا
(ہجوم کا شور بچے کی آواز پہ غالب آ جاتا ہے)

احمد فراز کے تراجم

احمد فراز کی کتاب ''سب آوازیں میری ہیں'' تراجم پر مشتمل ہے۔ جن شاعروں کا ترجمہ کیا گیا ہے، وہ کسی نہ کسی طرح آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں لڑ چکے ہیں یا ظلم کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ احمد فراز نے ان شاعروں کا انتخاب کیا ہے جو باغیانہ سوچ رکھتے ہیں جو آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے داعی ہیں۔ جنھیں ان کے نظریات کے سبب مجرم گردانا جاتا ہے اور سپر د دار کر دیا جاتا ہے۔

اپنے تراجم کے بارے میں احمد فراز کی اپنی رائے دیکھیے:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب فیض صاحب علامہ اقبال کے فارسی کلام کا منظوم اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ فیض صاحب سے بے پناہ عقیدت کے باوجود کسی حد تک میں بے تکلف بھی تھا ایک روز میں نے ان سے عرض کیا کہ ''آپ ان تراجم میں اپنا وقت کیوں صرف کر رہے ہیں۔ یہ کام تو دوسرے لوگ بھی انجام دے سکتے ہیں آپ کے بے شمار مداح اور عقیدت مند آپ کی تازہ تخلیقات کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ عالم یہ ہے کہ اگر کوئی کہیں سے آپ کا نیا شعر یا مصرع سن لے تو بطور سوغات دوسرے شہروں اور دوستوں تک پہنچانے کے لیے بے قرار رہتا ہے''۔ فیض صاحب نے ہمیشہ کی طرح مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کیا تم پر کبھی شعر گوئی میں Barren Period نہیں گزرا یا نچھ پن کا ایسا وقت جو بعض اوقات مہینوں پر پھیل جاتا ہے۔'' میں نے عرض کیا ''کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ طویل عرصہ تک مصرع بھی نہیں کہا۔ تو پھر اُس زمانے میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے جنگ ہو نہ ہو سپاہی کو اپنے ہتھیار صیقل رکھنے چاہئیں -----

''سب آوازیں میری ہیں'' کے تراجم محض تخلیقی ہتھیاروں کو صیقل رکھنے کی غرض سے ہی نہیں کیے گئے بلکہ کچھ اور محرکات بھی تھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں خود انہی حالات سے گزر رہا ہوں جن سے بیشتر افریقی جلاوطن شاعر دوچار ہیں اور اپنی سرزمین سے دور اپنے لوگوں کی انقلابی جدوجہد میں قلمی حوالے سے شریک

ہیں ۔دوسرا سبب یہ کہ پاکستان اور جنوبی افریقہ کے تاریخی اور سیاسی کوائف مختلف ہوتے ہوئے بھی کئی طرح کی مماثلت رکھتے ہیں ۔جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت نے جس ظلم اور ڈھٹائی سے مقامی سیاہ فام اکثریت کو انسانی توقیر اور حقوق سے محروم کر رکھا ہے اسی طرح پاکستان میں فوجی آمریت نے بھی ظالمانہ اور غاصبانہ رویہ سے اپنے ہی لوگوں کو محکوم بنا رکھا ہے ۔فرق اتنا ہے کہ وہاں بندوق کی لبلبی پر گوری انگلیوں کی جنبش حریت پرستوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے اور پاکستان میں جمہوریت پسند دانشوروں سیاسی کارکنوں صحافیوں اور طلبہ کا لہو زمین کا رزق بن رہا ہے ۔ غالبًا یہی بنیادی وجہ ہے کہ افریقی شاعری موضوعات کی حیرت انگیز مماثلت کے سبب پاکستان کے حالات کی بھی عکاس معلوم ہوتی ہے ۔

ایک مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کہ جنوبی افریقہ کی بڑی اور اچھی شاعری کو اردو طبقہ سے بالعموم اور پاکستان کے ادیبوں شاعروں سے بالخصوص روشناس کرایا جائے ۔ساتھ ہی یہ احساس دلانا بھی مقصود ہے کہ جب خلقِ خدا ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزما ہو اور لوگ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جانیں تک قربان کر رہے ہوں تو لکھنے والوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس تناظر میں ان کا کیا کردار ہونا چاہیے ۔

میں اپنے مختصر پیش لفظ کو افریقی ادیب کے اس جملہ پر ختم کرتا ہوں :صرف قیدی پرندہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیوں نغمہ سرا ہے ۔''

جن شعرا کے تراجم شامل ہیں ان شاعروں میں ایک Mazisi Kuiene ہیں ۔جن کا تعلق ڈربن شہر سے ہے وہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۹ء سے جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ لاتعداد رسائل میں ان کی نظمیں شائع ہو کر افریقی شاعری کے بہت سے انتخابوں میں شامل ہو چکی ہیں ۔آپ لاس اینجلس (امریکہ) کیلیفورنیا یونیورسٹی میں افریقی ادب کے پروفیسر ہیں ۔ان کی نظم انتقام دیکھیے :

تمھیں کیسا لگے گا
اگر میں رات کے اندھیروں میں آؤں
اور تمہارے پہلو میں نیزہ اتاروں
اپنے ان شہیدوں کا انتقام لینے کے لیے
جن کو تم نہیں جانتے تھے

جن کے زخم مخفی ہیں
جن کی کوئی یادگار نہیں
وہ جن کو تم صرف جشن کے اوقات میں
یاد کرتے ہو
ہم ان کو نہیں بھولے
روز بروز
ہمارے انتقام کی آگ تیز
اور اس کے شعلے
تمہارے شہروں
تمہارے بچوں کے گرد
اپنا حلقہ تنگ کرتے جاتے ہیں
جو راکھ کے مینار بن کے
ہمارے انتقام کی گواہی دیں گے

ایک اور افریقی شاعر Dennis Butus زمبابوے میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں جنوبی افریقہ سے ہجرت کر کے لندن آئے تھے۔ اٹھارہ ماہ تک قید با مشقت اور ایک برس تک خانہ بندی کے بعد برطانیہ آ گئے۔ ان کی پہلی کتاب ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی ایک نظم ''آج جیل خانے میں'' دیکھتے ہیں۔

آج جیل خانے میں
ایک خاموش عہد کے تحت
ہم قیدیوں کو ایک گیت گانے کی اجازت ہے
افریقہ سلامت رہے
صرف ایک گیت
کم آہنگی اور متانت کے ساتھ
جذبوں پر ضبط کے بند باندھ لو
احساسات کی لو نیچے رکھے رہو
قیدی توانا مگر استوار آوازوں میں گاتے ہیں
افریقہ تیری خیر ہو

آنکھوں کے پیچھے
دل کی گہرائیوں سے امڈے نکیلے آنسو
بے ٹھکانا پرندے کی وحشت کی طرح
کوئی نام مقام ڈھونڈتے ہیں
جن پر قیام کرسکیں
ان کارناموں کا ذکر
جو وہ انجام دے چکے
ان مرحلوں کا تذکرہ
جن سے گزر رہے ہیں
اُن مُرادوں کی فہرست
جن کے حصول کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے
آج جیل خانے میں
ہمیں ایک گیت گانے کی اجازت ہے۔

ایک اور اہم شاعر Hugh Lewin ہے جو ۱۹۳۹ء میں مشرقی ٹرانسوال میں پیدا ہوا۔ دہشت پسندی کے الزام میں سات سال میں جیل میں گزارنے کے بعد لندن آ گیا جہاں وہ تحریر و تصنیف میں مصروف ہے۔اس کی ایک نظم پھانسی ملاحظہ کیجیے۔

(جنوبی افریقہ کے ایک جیلر نے کہا ہمارے ہاں مجرموں کو موت کی سزا دینے کے لیے نہایت مہذب اور انسانی طریقہ ہے)

میں ایک مرتبہ
ایک شخص سے ملا
جس کی موت
نہایت ''مہذب طریقے'' سے واقع ہونے والی تھی
اسے آخری ملاقات کے لیے
ملاقات کے کمرے میں لے جایا جا رہا تھا
وہ سر اٹھائے اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا
جہاں ایک دھوپ کا ٹکڑا مچل رہا تھا
جب ہم ایک دوسرے سے ٹکرائے

تو اس نے سر نیچا کر کے
میری طرف دیکھا
مسکراتے ہوئے اس نے نہایت ملائمت سے کہا
''معاف کیجیے''
اور مجھے عجیب نا آسودگی میں چھوڑ گیا
وہ موت کی سزا پانے والے خاکی رنگ
کے مخصوص کپڑوں میں تھا
بغیر بٹنوں
بغیر تسموں
بغیر پیٹی کے
فقط حفظِ ماتقدم کے طور پر
تا کہ وہ ''مہذب طریقے'' سے مرنے کی بجائے
خود کو لٹکا نہ دے
تمام ممکنہ احتیاطیں
تا کہ وہ خودکشی نہ کرے
دوسری صبح وہ اسے لینے آئے
یہ ایک ہلکی گرمی کا دن تھا
سورج نکل چکا تھا
اور تمازت بڑھ رہی تھی
وہ پانچ بجے صبح پہنچے
ایک منصف
دو فوجی لیفٹیننٹ
تین محافظ
اور پانچ علاقائی نائب محافظ
(جن کے پاس چابیوں کے گچھے تھے)
تمام پرسکون اور چوکنے
ان کے ساتھ ہی

ایک کمانڈر
ایک ڈاکٹر
اور ایک پادری بھی تھا
(پادری کو صرف دہرے دروازے تک آنے کی اجازت تھی جہاں وہ بے بسی سے
صرف دعائیں پڑھ رہا تھا جب کہ باقی کے سب مجرم کی رہنمائی کرتے ہوئے دہرے
دروازے سے آگے بڑھ گئے)
دھوپ کا ٹکڑا بلند کھڑکیوں کے راستے سے کمرے
میں اتر رہا تھا
وہ سب کے سب خوش خلق تھے
سب کے سب کچھ بڑبڑا رہے تھے
اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھکایا
اس کے ہونٹ خشک تھے
جس وقت اس کے سر اور چہرے پر نقاب
ڈالا جا رہا تھا
اس نے سیکشن وارڈ کا ہاتھ سہلایا
ہر کوئی چپ چاپ
بُت بنا دیکھ رہا تھا
بالکل اسی طرح جیسے
اس ساری کارروائی میں
ان کا کوئی حصہ نہ ہو
سب اس طرح پرسکون تھے
جیسے کوئی عام جگہ تھی
سب جانے پہچانے چہرے اور وردیاں تھیں
جیسے (کسی عبادت گاہ میں) بلند آواز میں بولنے کے خواہشمند ہوں
اس کے دونوں پاؤں کو تختے کی لکیروں کے مخصوص
ٹکڑے پر جوڑ دیا گیا
اس نے اپنے نقاب پوش سر کو

کسی متوقع آواز کو سننے کے لیے ایک طرف کو جنبش دی
جب اچانک تختہ کھسکا
جھٹکا
گلے میں پھندے کی گرفت سخت ہوگئی
اور سخت ہوگئی
اور وہ لٹک گیا
بیس منٹ تک اس کے جسم کو لٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا
تا آنکہ
ڈاکٹر نے
آخری
قطعی
اور سرکاری اعلان کیا
ختم
اب لاش کو اتار دو
آخر میں ایک نظم دیکھیے منڈیلا جو آزادی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں پر کاری ضرب ہے۔
منڈیلا
صرف ۴۶۶/۶۴ نمبر ہے
جو اس جزیرے کی زمین پر
قلبہ رانی اور روشیں صاف کرتا ہے
مگر تم ایک قوت ہو
ایک استقامت ہو
اور اپنے بیٹوں کی شریانوں میں
جاری وساری ہو
جو تمہاری زمین کے لیے
جنگ لڑ رہے ہیں
ہاں
اپنے ہاتھوں میں بیلچے کو مضبوطی سے تھامے

اپنی مٹی کے لیے
کھیتوں میں مشقت کرتے رہو
اپنے دوسرے کئی بھائی بہنوں
بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح
جو افریقہ کی زمین کو
اپنی سخت کوشی کے پسینے سے سینچتے ہیں
یہ زمین ہماری ہے
ہمیں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنا
جب تک افریقہ ہمارے پاس واپس نہیں آتا

عجیب بات یہ ہے کہ ترجمے کو اصل کا نعم البدل سمجھا جاتا ہے لیکن فراز کے ان ترجموں پر اصل کا گماں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارا یہ شاعر آزادی کے ان متوالوں کے نظریات سے پوری ہم آہنگی رکھتا ہے۔ وہی باغیانہ سوچ، وہ احتجاجی لہجہ، وہی عدم مساوات کا شکوہ اور وہی ناانصافی کا راج، جو ادھر ہے وہ ادھر ہے۔ اس طرح وہ ان تراجم سے اپنے ہم نواؤں سے مکالمہ کر رہا ہے۔ آزادی و حریت کا یہ مجاہد افریقی شاعروں کے دکھ میں شریک ہے ان کی آواز پاسباں بن کر اُسے اس دیار میں بھی رواج دینا چاہتا ہے۔ یہ سب آوازیں فراز کی اپنی ہی آوازیں ہیں اور وہ ان میں اپنی مٹی کے خواب دیکھتا ہے۔ اپنے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈتا ہے۔ یہ سب آوازیں کسی نہ کسی طرح ہمارے خوابوں کی ترجمانی بھی کر رہی ہیں۔ فراز نے انہیں ہم سے روشناس کرا کے اردو ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

احمد فراز کی مزاحمتی شاعری

عہد جبر میں بہت ساری آوازیں یا تو خاموش ہو جاتی ہیں یا مدھم پڑ جاتی ہیں کیوں کہ اُس عہد میں بولنا اور اونچی آواز میں بولنا گناہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے عہد میں فیض احمد فیض اور حبیب جالب کے بعد احمد فراز ہی ایک ایسا شاعر نظر آتا ہے، جس نے ہر عہد میں آوازِ حق بلند کی ہے۔

ماضی بعید میں بہت سارے شاعر علامتوں میں بات کیا کرتے تھے۔انہوں نے بھی گلشن بلبل، گل اور چراغ جیسے استعارے استعمال کر کے، اپنی آواز اور مدعا لوگوں تک پہنچایا لیکن یہ انداز قدرے مبہم تھا۔احمد فراز اس لیے بھی منفرد ہیں کہ ان کے ہاں سچی بات قدرے سیدھے انداز میں کی گئی ہے۔انہوں نے اپنی بات کہنے کے لیے سامنے کے اور واضح استعارے استعمال کیے ہیں۔چند شعر دیکھیے:

کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہ گزر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

☆

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

☆

جو حرفِ حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا

☆

ہم وہاں ہیں کہ جہاں چشم کشائی کا صلہ
آنکھ کو زخمِ تماشا کی طرح ملتا ہے

☆

اور پھر سب نے یہ دیکھا کہ اُسی مقتل سے
میرا قاتل مری پوشاک پہن کر نکلا

☆

جب سارا شہر برف کے پیراہنوں میں تھا
ان موسموں میں لوگ تھے شعلہ قبا کہ میں
جب دوست اپنے اپنے چراغوں کے غم میں تھے
تب آندھیوں کی زد پہ کوئی اور تھا کہ میں
کل جب رکے گا بازوئے قاتل تو دیکھنا
اے اہلِ شہر تم تھے شہیدِ وفا کہ میں

☆

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے
وہ مروت سے ملا ہے تو جھکا لوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

اگر دیکھا جائے تو احمد فراز کے احتجاج میں ایک وقار اور متانت ہے، انہوں نے جو لہجہ اپنایا ہے وہ کاٹ دار ضرور ہے۔ مگر اس کی کاٹ میں بھی ایک تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔ محاصرہ ایک ایسی نظم ہے کہ اس پورے عہد میں مزاحمتی شاعری کے حوالے سے کوئی اور ایسی نظم منظرِ عام پر نہیں آئی۔ بڑی شاعری دراصل ہر زمانے میں اپنا جواز آپ ہوتی ہے۔ فراز نے جب "محاصرہ" لکھی تو اس وقت ایک سیاہ رات چور دروازے سے ہماری زندگیوں میں در آئی تھی۔ یقین کو گمان نے مخمصے کی سولی پر لٹکا دیا تھا۔ آوازیں تو کیا سائے تک زندانوں میں دھکیل دیے گئے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس نظم کا لہجہ کتنا پُر اثر اور بیان کتنا دلنشیں ہے۔ فارسی اردو کے امتزاج نے ایک الگ لطف سے ہم کنار کیا ہے۔ لفظی دروبست سے لے کر علامت سازی اور معنی آفرینی میں کمال کی ہنر مندی نظر آتی ہے۔ مصرعوں کی بُنت میں جو شکوہ ہے، اُس کی مثال کم کم ہی نظر آتی ہے۔

یہاں ان کی یہ پوری نظم درج کی جارہی ہے تا کہ مجموعی طور پر حظ اٹھایا جاسکے تو دیکھیے نظم محاصرہ:

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

☆

وہ برق لہر بُجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اُس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

☆

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے

☆

تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اُٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

☆

تُم اہلِ حرف کے پندار کے ثناگر تھے
وہ آسمانِ ہُنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اِک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں

☆

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تمہارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

☆

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تُم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو

☆

یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اُسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اِک نیا سورج تراش لاتی ہے

☆

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پہ گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

☆

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

☆

مرا قلم نہیں اس نقب زن کا دستِ ہوس
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پہ کمند اُچھالتا ہے

☆

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کا
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

☆

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے

اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

☆

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائگاں نہ جائے گا

☆

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

احمد فراز ایک سچا اور کھرا شاعر ہے۔اُس کے ہاں مصلحت ہے نہ مصالحت، وہ جس کو دوست رکھتا ہے اُسے دوست رکھتا ہے اور جسے دُشمن گردانتا ہے اُسے واقعی دشمن سمجھتا ہے۔اُن کی یہ ادا زمانے کو شاید بری لگتی ہو مگر وہ خود اس سے بہت مطمئن ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ زندگی اپنے طور پر گزاری جائے اور زندگی کے لیے اپنے اصول اور ضابطے مرتب کیے جائیں۔اسی لیے بعض اوقات ان کا لہجہ قدرے سخت بھی ہو جاتا ہے۔وہ ظلم اور ناانصافی جہاں کہیں بھی ہو برداشت نہیں کر سکتے۔ہر جبر اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں اور بعض اوقات تو آوازِ حق اٹھانے کی پاداش میں پابند سلاسل بھی ہو جاتے ہیں مگر اپنی بات سے نہیں ہٹتے اور کسی بھی حال میں صلح گیر نہیں ہوتے:

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

تقریباً نصف صدی پر محیط ان کی شاعری کے زمانوں نے ظلم وجبر کے کئی عہد دیکھے ہیں اور ہر عہد میں اُن کا قلم سرخرو رہا ہے۔اس دوران وہ اپنے ہم عصروں سے گلہ مند بھی رہے ہیں کہ کوئی اُن کی آواز میں آواز ملانے والا نہیں۔یہ الگ بات کہ اور بھی بہت سارے لوگوں نے جبر کے خلاف احتجاج کیا مگر ان کے احتجاج میں اتنی بلند آہنگی، تسلسل اور کاٹ نہ تھی۔یہ آوازیں وقت کے ساتھ یا تو ختم ہو گئیں یا مدھم پڑ گئیں مگر فراز نے مسلسل علم احتجاج بلند رکھا۔کسی بھی حال میں اور کسی بھی سطح پر اُس جبر کے آگے سپر نہیں ڈالی۔یہاں تک کہ وہ بے حال، پسے ہوئے مظلوم طبقے کے ترجمان بن گئے ہیں۔کچھ اس طرح کہ اُن کی شاعری نعرہ بھی نہیں بنی اور اس میں شعری حسن بھی برقرار رہا ہے:

میں تو لب کھول کے پابندِ سلاسل ٹھہرا
تیری بات اور ہے تُو صاحبِ محفل ٹھہرا
کیا کہوں کس نے قبیلہ مرا تقسیم کیا
آج یوں ہے کوئی بسمل کوئی قاتل ٹھہرا
خوشنوایانِ چمن سب ہیں اسیرانِ قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزارِ عنادل ٹھہرا
کتنے ہی سخت مقام آئے مگر جانِ فراز
نہ ترا درد ہی ٹھہرا نہ مرا دل ٹھہرا
پھر اس طرح ہوا مجھے مقتل میں چھوڑ کر
سب چارہ ساز جانبِ دربار آ گئے
سورج کی دوستی پہ جنہیں ناز تھا فراز
وہ بھی تو زیرِ سایۂ دیوار آ گئے
کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فراز
امیرِ شہر بھی ہے اور خطیبِ شہر بھی ہے

ان کی ایک نظم "اب کے برس" دیکھیے جس میں ناامیدی کا ملال ایک سانحے کی صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔صورت حال میں بہتری کے امکانات معدوم دکھائی دیتے ہیں اور ایسے میں شاعر کا دلِ زار جوغم و یاس کا شکار ہے آپ بھی دیکھیے:

لب تشنہ و نومید ہیں ہم اب کے برس بھی
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب کے برس بھی
کچھ بھی ہو گلستاں میں مگر کنجِ چمن سے
ہیں دُور بہاروں کے قدم اب کے برس بھی
اے شیخِ کرم! دیکھ کہ باوصفِ چراغاں
تیرہ ہیں درو بامِ حرم اب کے برس بھی
اے دل زدگاں! خیر مناؤ کہ ہیں نازاں
پندارِ خدائی پہ صنم، اب کے برس بھی
پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریٔ ایام
ہیں کشتۂ غم کشتۂ غم اب کے برس بھی

لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسّم
ہو گا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی
ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں
روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی
پہلے کی طرح ہوں گے تہی جامِ سفالیں
چھلکے گا ہر اک ساغرِ جم اب کے برس بھی
مقتل میں نظر آئیں گے پابستۂ زنجیر
اہلِ نظر و اہلِ قلم ، اب کے برس بھی

☆☆

باغباں ڈال رہا ہے گل و گلزار پہ خاک
اب بھی میں چپ ہوں تو مجھ پر مرے اشعار پہ خاک
سرِ دربار ستادہ ہیں پئے منصب و جاہ
تُف بر اہلِ سخن و خلعت و دستار پہ خاک
آ کے دیکھو تو سہی شہر مرا کیسا ہے
سبزہ گل کی جگہ ہے در و دیوار پہ خاک
لے کر اک نانِ جویں رزقِ مشقت تھا فرازؔ
آ گیا ڈال کے میں درہم و دینار پہ خاک

☆☆

اُس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی
میں تو لے آیا وہی پیرہنِ خاک اپنا
اُس نے جب خلعت و دستار کی قیمت چاہی

میرے خیال میں تو فراز کی پوری شاعری ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت ہے جو اک طویل مضمون کا تقاضا کرتی ہے ۔ میں یہاں احمد فراز ہی کے ایک شعر پر بات ختم کرتا ہوں:

ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے

☆☆☆☆

فراز کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی

کہتے ہیں کہ وطن کا خار پردیس کے پھول سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ وطن سے محبت وہی کر سکتا ہے، جس نے غریب الوطنی کا عذاب دیکھا ہو۔ جلا وطنی کے دن گزارے ہوں اجنبی دیسوں کی شاموں سے ہمکلامی کی ہو۔ بے دیار صبحیں دیکھی ہوں۔ فراز ایسے شاعر ہیں جو ان سب کربناک لمحوں سے گزرے ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی رہ رہے ہوں، اُن کی سوچ کی ایک کھڑکی وطن کی طرف ضرور کھلتی ہے۔ انہیں اپنی مٹی سے والہانہ محبت ہے، اس کا اظہار ان کے ترانوں اور نغموں میں جا بجا ملتا ہے۔ اُنہیں اپنے شہیدوں پر فخر ہے۔ وطن کے جانثاروں کو سلام پیش کرتے ہوئے وہ ہر بار وفا و عشق سے لبریز نظر آتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا کہ زندگی کا عرفان شروع ہی اس وقت ہوتا ہے، جب ہم زندگی کو ایک المیہ سمجھنے لگیں۔ فراز جانتے ہیں کہ ہم اس سرزمین تک آتے آتے کتنے خارزاروں سے گزر کر آئے ہیں۔ ملک آزاد ہوتا ہے تو اُسے وہ لوگ یاد آتے ہیں جو اس سفر میں جان کی بازی ہار گئے۔ ملک دولخت ہوتا ہے تو شاعر کی قومی حمیت اُسے آتش بہ پا کر دیتی ہے۔ وہ جب کچھ نہیں کر سکتا تو خون کے آنسو روتا ہے اور پھر یہ آنسو شعروں کی صورت میں کاغذ پر رکھ دیتا ہے۔ اُسے وطن سے محبت ہے اور اس کی حب الوطنی کا ایک واقعہ سیّد ضمیر جعفری کی زبانی سنیے:

> ''فراز کی حب الوطنی کے ایک مظاہرے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ محبّ الوطن ہے۔ یہ نومبر 1993 کی بات ہے ہم لوگ اسلام آباد کے ایک ادبی اجتماع میں کشمیر کے مسئلے پر ایک قرارداد کی حمایت میں اہلِ قلم کے دستخط حاصل کر رہے تھے۔ قرارداد میں کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کرتے ہوئے بھارت سے مجلسِ اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق اس مسئلے کے تصفیے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔
>
> فراز کے بارے میں بعض دوست متذبذب تھے۔ میں کاغذ لے کر فراز کے پاس گیا تو اُس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ تقریباً چنگھاڑتے ہوئے بولا ''یہ کیا لکھ لائے ہو قراردادوں سے کچھ نہیں ہو گا۔ میں دستخط نہیں

کرتا'' میں سمجھا وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا مگر جب یہ کہتے ہوئے ''یہ قرارداد بڑی بے جان ہے۔ لہجہ معذرت خواہانہ ہے۔ ہمیں کشمیر کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ ''اسرٹ'' (Assert) کرنا ہوگا'' تو اس کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہیں ایک صاحب نے بتایا کہ فراز نے اس مسئلے پر بمبئی میں Zee TV پروگرام ''سرحد جج میں اپنے مدِ مقابل ہندوستان کے وکیلوں (سنیل دت، کلدیپ نیئر، کرتار سنگھ دگل اور عارف محمد خان) کو کھری کھری سنائیں۔ یہ ''لال پیلا انٹرویو'' دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی حب الوطنی کے بارے میں سوئے ظن کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں اور اس عمل میں لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔''

سب سے پہلے فراز کی ایک نظم اے مری ارضِ وطن دیکھیے جس میں شاعر وطن کی دہلیز پر نگوں سار کھڑا ہے۔

اے مری ارضِ وطن، پھر تری دہلیز پہ میں
یوں نگوں سار کھڑا ہوں کوئی مجرم جیسے
آنکھ بے اشک ہے برسے ہوئے بادل کی طرح
ذہن بے رنگ ہے اُجڑا ہوا موسم جیسے
سانس لیتے ہوئے اس طرح لرز جاتا ہوں
اپنے ہی ظلم سے کانپ اُٹھتا ہے ظالم جیسے

تُو نے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تو نے وہ سحر مرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے
تو نے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

اور میں مستِ مے رامش و رنگِ ہستی
اتنا بے حس تھا کہ جیسے کسی قاتل کا ضمیر

یہ قلم تیری امانت تھا مگر کس کو ملا؟
جو لٹا دیتا ہے نشّے میں سلف کی جاگیر
جیسے میزانِ عدالت کسی کج فہم کے پاس
جیسے دیوانے کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیر

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے مرے گھر کا چراغ
تیرے میخانے پہ کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
اور میں خوش تھا سلامت ہے ابھی میرا ایاغ
میں نے اپنے ہی گنہگار بدن کو چوما
گرچہ جویائے محبت تھے ترے جسم کے داغ

حجلۂ ذات میں آئینے جڑے تھے اتنے
کہ میں مجبور تھا گر محوِ خود آرائی تھا
تیری روتی ہوئی مٹی پہ نظر کیا جمتی
کہ میں ہنستے ہوئے جلووں کا تمنائی تھا
ایک پل آنکھ اُٹھائی بھی اگر تیری طرف
میں بھی اوروں کی طرح صرف تماشائی تھا
اور اب خواب سے چونکا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
ایک اک حرف مرا تیرِ ملامت ہے مجھے
تُو اگر ہے تو مرا فن بھی مری ذات بھی ہے
ورنہ یہ شامِ طرب صبحِ قیامت ہے مجھے
میری آواز کے دُکھ سے مجھے پہچان ذرا
میں تو کہہ بھی نہ سکوں کتنی ندامت ہے مجھے

آج سے میرا ہنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اُتاروں گا تجھے

وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلم ہے پکاروں گا تجھے

فراز نے بہت سے ترانے لکھے اور لاجواب لکھے۔ ان ترانوں میں مٹی کی خوشبو اور وطن کی محبت موجزن ہے۔ ولولوں کا ایک جہاں آباد ہے۔ جذبوں کی آتش اور فکر کی جولانی ہے مٹی کی محبت میں اس کے دریاؤں جیسی روانی ہے۔ وہ وطن کے حوالے سے نظم لکھتے ہیں تو لاجواب اور ترانہ لکھتے ہیں تو کمال کر دیتے ہیں۔ کیا یہ ترانہ پڑھ کر کوئی ذی شعور یہ کہہ سکتا ہے کہ فراز کو وطن سے محبت نہیں۔

دائم آباد تیری حسیں انجمن
اے وطن ---- اے وطن ----

تیرے کھیتوں کا سونا سلامت رہے
تیرے شہروں کا سُکھ تا قیامت رہے
تا قیامت رہے یہ بہارِ چمن
اے وطن ---- اے وطن ----
تیری آباد گلیاں مہکتی رہیں
تیری راہیں فضائیں چمکتی رہیں
مسکراتے رہیں تیرے کوہ و دمن
اے وطن ---- اے وطن ----

تیرے بیٹے تری آبرو کے لیے
یوں جلائیں گے اپنے لہو کے دیے
پھوٹ نکلے گی تاریکیوں سے کرن
اے وطن --- اے وطن ---
دائم آباد تیری حسیں انجمن

ابھی میں نے وطن کے دولخت ہونے کا ذکر کیا تھا۔ کون سا دل ایسا ہوگا جو اس سانحے پر ملول نہ ہوا ہوگا۔ کون ہوگا جس کے دل پر زد نہ پڑی ہوگی۔ ایسے میں ایک حساس دل رکھنے والا شاعر کیسے

خاموش رہ سکتا ہے۔میری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ 1972 میں لکھی گئی اور یہ نظم اُس پورے عہد کی منظر کشی کرتی ہے، جب ہم ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔ہم نے اپنا تشخص کھو دیا تھا:

میری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ

۱۷ دسمبر ۷۲ء

آج کے دن
مرا چہرہ مری آنکھیں لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں
وہی آنکھیں
جو گئے سال گئی تھیں تو نہ واپس آئیں

جو سرافرازی لوٹی ہیں نہ بے بس آئیں
وہی چہرہ
جو شفق بن کے کھلا تھا
نہ بنا صبح کا سورج
نہ مری شام کا پیوند ہُوا
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لاؤ
کہ مرے ہاتھ مرا دل
مرے بازو مرے ارماں
مرا سارا پیکر
خود کو پہچان سکے
وہ جو بھونچال نکل آیا تھا
جو گزری تھی قیامت
اسے نیرنگِ نظر جان سکے
میں ابھی زندہ ہوں
موجود ہوں

یہ میری انا مان سکے
آج کے دن ہی گئے تھے
مرے ساتھی
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لے کر
ان اندھیروں کے سمندر کی طرف
جہاں مرتی ہوئی شمعوں کی ضیا چیختی تھی
جہاں نفرت سے حقارت سے
ہر اک موجِ بلا چیختی تھی
کشتیاں کرب سے گرلاتی تھیں
ساحل کی ہوا چیختی تھی
مجھ کو معلوم تھا
بے جاں ہیں رجز کے نغمے
میرے لفظوں میں فنا چیختی تھی
اب نئے سال کی تقویم کا پہلا دن ہے
اور مرے پاس نہ شعلہ بھری آنکھیں ہیں
نہ انگار سا چہرہ ہے کہ میں
اپنے یاروں سے کہوں
تم تہِ دام سسکتے ہو
مگر ہم بھی سرِ شاخِ چمن
دل گرفتہ ہیں
کہ یارانِ صبا کب آئیں
ہم بھی ہر پھول کو ہر خار کو
سینوں سے لگائیں
گل و گلشن کو سجائیں
وہ جوانانِ چمن جب آئیں
نئی تقویم کے اوراق چمک اٹھیں

اور آئینوں میں
عکس بچھڑے ہوئے یاروں کے نظر سب آئیں
اے اسیرانِ عدو!
تم تو اس دیس کی مٹی ہو کہ جو
جس قفس میں بھی ہو
زنداں کی فضا مہکے گی
اب اسیری کے نامعلوم زمانوں کو مقدر کر لو
کس پہ افشا ہے
کہ آزردہ پرندوں کی زباں
کب چہکے!
جانے کس روز مرے شہر کو لوٹے گی
وہ غربت کی بہار
جس میں فصلِ گل ولالہ
نئی شمعوں کی طرح لہکے گی
اور فضا اس طرح دہکے گی
کہ محشر میں جہنم جیسے
ہر طرف آگ کے دریاؤں میں
شعلوں کا تلاطم جیسے
میری تقویم کے نوروز
پھر اُٹھیں گے
مرے زخم کا پرچم
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لے کر
سرِ میدانِ وفا تم جیسے
آج لیکن مری مانند
ہر اک صحن
ہر اک کھیت

ہر اک راہ میں
مفلوج ادھورا پیکر
چیختا ہے
مری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں

عہد حاضر تو کیا ہمارا یہ شاعر ابھی تک جنگِ آزادی 1857ء کے شہدا کو نہیں بھولا۔ اسے وہ سارے سپاہی یاد ہیں جو آزادی کی راہ میں کام آئے تھے۔ جن کے دم سے ہم نے صبح زرنگار دیکھی اور نئی منزل کی طرف گامزن ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر نہ صرف عصری آگہی رکھتا ہے بلکہ اُسے تاریخی ادراک بھی ہے۔ نظم دیکھیے شہدائے جنگِ آزادی 1857ء کے نام:

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنا کو لہو سے سینچا
ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی عہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اِک بوند نے طوفان اٹھایا آخر
تم نے اِک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر
وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زلفِ آزادی کے ہر تار سے دستِ ایام
حریت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہُوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی جنگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہارا پنے لیے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہہِ اُمید بنی
ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

پھر تقریباً سو سال بعد جب ہم آزاد ہوتے ہیں تو شاعر قائداعظم محمد علی جناح کے حضور شکوہ کناں ہے کہ تم نے آزادی جیسی نعمت دلائی اور ہم نے اُس آزاد وطن میں کیا کیا۔ اس نظم میں لہجہ مدھم ہے مگر درد پیہم ہے جس کا اظہار ملال ویاس کے عالم میں ہوا ہے۔ نظم ہے تیرے بعد اور یہ ہے بحضور قائداعظم:

پھول روتے ہیں کہ آئی نہ صدا تیرے بعد
غرقۂ خوں ہے بہاروں کی ردا تیرے بعد
آندھیاں خاک اُڑاتی ہیں سرِ صحنِ چمن
لالہ و گل ہوئے شاخوں سے جُدا تیرے بعد
جاہ و منصب کے طلبگاروں کے یوں ہاتھ بڑھے
کوئی دامن بھی سلامت نہ رہا تیرے بعد
جن کو اندازِ جنوں تو نے سکھائے تھے کبھی
وہی دیوانے ہیں زنجیر بہ پا تیرے بعد
کس سے آلامِ زمانہ کی شکایت کرتے
واقفِ حال کوئی بھی تو نہ تھا تیرے بعد
اب پکاریں تو کسے زخم دکھائیں تو کسے
ہم سے آشفتہ سر و شعلہ نوا تیرے بعد
پھر بھی مایوس نہیں آج ترے دیوانے
گو ہر اک آنکھ ہے محرومِ ضیا تیرے بعد
راستے سخت کٹھن منزلیں دشوار سہی
گامزن پھر بھی رہے آبلہ پا تیرے بعد

جب کبھی ظلمتِ حالات فضا پہ برسی
مشعلِ راہ بنی تیری صدا تیرے بعد
آج پھر اہلِ وطن انجم و خورشید بکف
ہیں رواں تیری دکھائی ہوئی منزل کی طرف

ڈاکٹر احمد فاروق مشہدی لکھتے ہیں کہ:

''فراز کے ہاں اجتماعی تجربے کی دوسری باقاعدہ سمت ''شب خون'' ہے۔ ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں اس شاعری کا لہجہ بھی پہلے سے مختلف ہے اور مضامین بھی۔ ہماری تاریخ کے ایک نازک اور امتحان کے لمحے میں ایک دردمند اہلِ قلم نے جو کچھ محسوس کیا وہ ''شب خون'' میں موجود ہے، اس میں تجربے کی شدت اور اظہار کی حدت ہے کہ صورتِ حال کا تقاضا بھی یہی تھا۔''

''بے آواز گلی کوچوں میں'' فراز کے ہاں اجتماعی تجربے کی تیسری جہت ہے۔ مناظر، واقعات، صورت حال پس منظر اور پیش منظر سب کے سامنے ہیں مگر ہر ایک کا انداز نظر اور تجربہ مختلف ہو سکتا ہے۔ ہم سب اجتماعی سطح پر ایک خاص صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ہم ایک ایسی فضا میں سانس لے رہے ہیں، جہاں اشیا' لفظ' لوگ، مناظر اور رشتے..... اپنے تناظر اور اعتبار گم کر رہے ہیں یا تبدیل کر رہے ہیں۔ کبھی سب کچھ تھا اور سچ محسوس ہوتا تھا، اب بھی سب کچھ ہے مگر سچ میں شک اور بے یقینی کا زہر گھل گیا ہے۔ ذات کا سوچ کا اور اظہار کا بحران ہم سب پر ہے مگر تجربے کی اس معنویت اور شدت کو محسوس کر کے بیان کر دینا سب کے حصے میں نہیں آیا۔ یوں لگتا ہے کہ فراز کو (بے آواز گلی کوچوں میں) اپنی تنہائی کا احساس ہے۔ کبھی یہ تنہائی اپنی ذات کے اندر قید ہو جانے کا راستہ سجھاتی ہے کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ آشفتہ سروں کا قحط ہے، دیوار سے سر پھوڑنے والوں کی کمی ہے سب کو امن کیوں دکھائی دیتا ہے جب کہ امن دراصل ہے نہیں۔ کتنے ہی تھے جو ہماری طرح ہماری سچائیوں پر جان دیتے تھے مگر اب ان کا ساتھ نہیں رہا، ان کے قبیلے بھی تبدیل ہوئے اور سچائیوں کے پیمانے بھی..... حالات سے سمجھوتا کر کے خوشی سے جیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم سے ایسا نہ ہو سکا اور ہم اکیلے ہو گئے۔

احمد فراز کی نظم ''میں کیوں اداس ہوں'' ایک تاریخی دستاویز ہے۔ جس میں کشمیر، ہیروشیما اور ویت نام جیسے دیاروں کا المیہ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ المیہ ہماری اپنی سرزمین کا المیہ بھی ہے۔ اس نظم کے صرف تین بند دیکھیے:

لہو لہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں

نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں
وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنوں بھی وہی
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
وہ ہیروشیما ہو، ویتنام ہو کہ بٹ مالو(۱)
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج اپنا
متاعِ درد سبھی پر نثار اپنی ہو
نہیں کہ درد نے پتھر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب ، میرے شعر ثبوت
کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

کشمیر کے حوالے سے ان کی نظمیں نیا کشمیر اور یہ پرچم جاں جو تحریک آزادی کشمیر کی نذر ہے، ایک جدوجہد اور نئے سفر کی طرف راہ دکھاتی ہیں۔ حوصلہ اور جاں سپاری کا جذبہ روح پرور ہے۔ اسی عالم میں شاعر چلو پھر ہم صف آرا ہوں جیسی نظم لکھتا ہے۔ اسی زمانے میں جب شاعر کے آبائی شہر کوہاٹ پر بمباری ہوتی ہے تو شاعرانہ جذبات کا اظہار کرتا ہے:

اے مرے شہر!

''جنگ ۱۹۶۵ء میں ۱۴ستمبر کو کوہاٹ پر بھارت کی وحشیانہ بمباری کی وجہ سے بے شمار معصوم جانیں تلف ہوئی تھیں:

مرے شہر!
میں تجھ سے نادم ہوں

۱۔ کشمیر کا ایک قصبہ

اس خامشی کے لیے
جب عدو تیری خوابیدہ گلیوں پہ
بھیگی ہوئی رات میں
آگ برسا رہا تھا
میں چپ تھا

مرے شہر!
میں تیرا مجرم ہوں
اس بے حسی کے لیے
جب ترے بام و در
طاق و دہلیز و دیوار
تیرے مکینوں کے
خونِ حنا رنگ سے
تر بتر ہو رہے تھے
تو میں چشم بستہ تھا

اے میرے آبا کے مسکن!
میں تیرا گنہگار ہوں
جب ترے آئینہ رنگ چشموں سے
اک جُوئے خوں آ ملی تھی
تو میرے لبوں پر
کوئی حرفِ ماتم نہ آیا
کہ جب تیرے زرتاب خرمن پہ
سفاک بجلی گری تھی
تو میں تیری جلتی ہوئی کھیتیوں کی طرف
با دلِ چاک و با چشمِ پُرنم نہ آیا

میں شرمندہ ہوں
اے مرے برگزیدہ بزرگوں کی بستی
کہ اس درد کی فصل میں
تیرے فرزند شاعر کی نوکِ قلم پر
ترا اسمِ اعظم نہ آیا
یہ سب کچھ بجا ہے
یہ سب کچھ بجا ہے
مگر اے مقدس زمیں!
تیری مٹی نے جب میری صورت گری کی
تو ورثے میں تُو نے
مجھے ایسا دل دے دیا تھا
جو اپنے دُکھوں کے سمندر نہ دیکھے
مگر دوسروں کے نمِ چشم سے باخبر ہو
مجھے تیری گِل نے وہ احساس بخشا
جو اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ
پتھر بنا دم بخود ہو
مگر کاہشِ دیگراں پر
سدا نوحہ گر ہو

مرے شہر!
جب تیرے سینے سے
مینارِ خوں اٹھ رہا تھا
میں اس وقت
غافل نہیں تھا
میں بے حس نہیں تھا
مگر اس گھڑی میرا سارا وطن

ظلم کی زد میں تھا
میرا سارا چمن
آ گ کی حد میں تھا
ساری دنیا کی مظلومیت ،میری آہوں میں تھی
ساری دنیا ہی میری نگاہوں میں تھی
اس سے
تُو ہی تُو تھا
پشاور کا
لاہور کا
اور
بنگال کا نام ،کوہاٹ تھا
کاشمیر
کوریا
ہیروشیما کا ویتنام کا نام ،کوہاٹ تھا
ساری مظلوم دنیا کے ہر شہر کا نام کوہاٹ تھا
اے مرے شہر!
میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی
خود سے نادم سہی
تو مرا شہر ہے
پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے
فقط تو نہیں ہے

یوں لگتا ہے دشمن نے ہمارے شاعر کی سرزمین کو نہیں قلم کو للکارا ہے ۔شاعر جنگ میں عدو کی طرف اشعار کے خدنگ بھیجتا ہے ۔وہ نغمے لکھتا ہے اور جوانوں کو جوش دلاتا ہے آخر میں ان احساسات کا حال آغا ناصر کی زبانی سنتے ہیں:

''مجھے ۱۹۷۱ء کی جنگ کا وہ زمانہ یاد ہے ، جب میں راولپنڈی میں ٹیلی وژن مرکز کا جنرل منیجر تھا احمد فراز ان دنوں پشاور میں تھے ۔لیکن ہفتے میں دو تین بار

ہماری دعوت پر راولپنڈی آتے اور جنگ کے دوران نشر کیے جانے والے پروگراموں کی تشکیل اور ترتیب میں ہماری معاونت کرتے۔ اس دوران انہوں نے ٹیلی وژن کے پروگراموں کے لیے بہت کچھ لکھا اور نہ صرف یہ بلکہ مجھے یاد ہے اپنی ایک غنائی تمثیل میں جس کا عنوان ''سپاہی اور موت'' تھا، انہوں نے بطور اداکار بھی حصہ لیا۔ جیسے جیسے جنگ کی صورتحال بدلتی گئی' حالات خراب ہوتے گئے تو ٹیلی وژن کے پروگرام بھی متاثر ہوتے گئے۔ وہ عجب زمانہ تھا، کچھ واقعات ایسے تھے جن کا ہمیں قطعی علم نہیں تھا مگر اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے لیے ہمیں حقیقت حال کے بالکل برعکس اظہار کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ ٹیلی وژن پر پروگراموں کی تشکیل کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا۔ چند اور دوستوں کی طرح احمد فراز نے بھی اس مشکل وقت میں ہمارا بڑا ساتھ نبھایا، وہ ہر قسم کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے اور قومی اہمیت کے حوالے سے ترتیب دیے جانے والے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے مگر ہاری جانے والی جنگ کے سپاہیوں کو ہم اپنے پروگراموں سے کب تک حوصلہ دے سکتے تھے۔ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ المناک ہوتا گیا اور آخر آخر تو یہ عالم تھا کہ احمد فراز میں بھی پشاور سے راولپنڈی آنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ میرے اصرار پر وہ پشاور سے ٹیلیفون پر اپنے نئے اشعار اور نئی نظمیں ہمیں لکھاتے اور ہم جلدی جلدی ان کی دھنیں بنوا کر انہیں نشر کرتے۔ یہ خصوصی پروگرام جو احمد فراز کی تخلیقات پر مشتمل تھا۔ ہمارے ایک بڑے ہونہار پروڈیوسر شہزاد خلیل مرحوم پیش کرتے تھے اور اس میں گلوکارہ کے طور پر طاہرہ سیّد حصہ لیا کرتی تھیں جو جنگ کے دوران راولپنڈی میں مقیم ہو گئی تھیں۔

جنگ ہاری جا چکی تھی، ملک دولخت ہو چکا تھا قوم غم خوردہ نڈھال تھی، مایوسی اور افسردگی کی دھند چہار اطراف پھیلی ہوئی تھی لیکن ہم سب زندہ تھے۔ زندگی کے کاروبار بہر حال چلنا تھے اور زندگی کے کاروبار میں ٹیلی وژن کے پروگرام بھی شامل تھے ہمیں نئی صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے پروگراموں کو نئے سرے سے ترتیب دینا تھا، مایوس اور افسردہ دلوں کو حوصلہ عطا کرنا تھا، شکست خوردہ قوم کو اُمید کی ایک نئی روشنی دینا تھی۔ اس کام میں احمد فراز پھر ہمارے ساتھ تھے، انہوں نے پشاور سے ٹیلیفون پر ہمیں کچھ نئی چیزیں لکھائیں۔ ان کا ایک نغمہ جو

طاہرہ سیّد نے بہت ہی محبت اور جذبے کے ساتھ گایا، آج تک میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ذرا ۱۹۷۱ء کے دسمبر کے آخری ہفتوں کی سرد تاریک اور غم ناک راتوں کا تصور کیجیے اور ان شعروں کو دیکھیے:

ہر طرف رواں دواں ظلمتوں کے کارواں
حادثے قدم قدم راستے دھواں دھواں
مشعلیں بُجھا گئیں روز و شب کی آندھیاں
پھر بھی اے مسافرو تم رہو رواں دواں رواں دواں

رہ روانِ شوق کو دل شکستگی ہے موت
جس میں ولولے نہ ہوں ایسی زندگی ہے موت
روشنی حیات ہے اور تیرگی ہے موت
پھر نئی امنگ سے گامزن ہو کارواں
تم رہو رواں دواں رواں دواں

پھر چلو کہ جل اٹھیں مشعلیں حیات کی
منتظر ہیں راحتیں ساری کائنات کی
اس نے کھائیں ٹھوکریں جس نے احتیاط کی
ایک جہدِ مستقل راہ ہے نجات کی
اک قدم اٹھاؤ تو پھر یہ مشکلیں کہاں
تم رہو رواں دواں رواں دواں

میں نے احمد فراز کا یہ نغمہ ہر رات بلکہ بعض اوقات ایک رات میں دو دو بار نشر کیا۔اس میں ایک عجیب سی کشش تھی، پژمردہ دلوں کیلیے امید کا پیغام تھا، ہاری ہوئی قوم کے لیے ایک نئی طرح کا حوصلہ تھا، زندہ رہنے اور جدوجہد کرتے رہنے کی دعوت تھی۔یہ اس صورت حال میں ایک حوصلہ مند شاعر کا ردِعمل تھا وہ جو کل تک اپنے سپاہیوں کو دشمن پر ضرب کاری لگانے کا ولولہ دے رہا تھا، وہی شاعر دل پر چوٹ کھانے کے بعد مایوسی کے اندھیروں میں روشنی کے نئے منبع تلاش کرنے لگا تھا، پھر سے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہا تھا، اسے اپنے وطن کی جبیں پر دمکنے والا زخم ''داغ غم شکست'' کی بجائے ''نقشِ فتح'' نظر آنے لگا تھا۔انھی دنوں احمد فراز کی یہ نئی نظم بھی ہم نے نشر کی:

لہو لہان مرے شہر میرے دوست شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں

وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنوں بھی وہی
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج اپنا
متاعِ درد سبھی پہ نثار اپنی ہو

نہیں کہ درد نے پتھر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب میرے شعر سبھی
کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

یہ نظم امید اور یقین کے ان لفظوں میں ایک نئے عزم کے پیغام پر ختم ہوتی ہے۔

جنوں فروغ ہے یارو عدو کی سنگ زنی
ہزار شکر کہ معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی
دریدہ سر ہیں تو کیا ہم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پہ دمک رہا ہے جو زخم
وہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں

☆☆☆☆

فراز کی شاعری میں عقیدتی حوالے

احمد فراز کا سیّد گھرانے سے تعلق ہے اور سادات سے محبت اُن کے خون میں شامل ہے۔ نعت کا بیان ہو یا سانحۂ کربلا کا حوالہ ان کی شاعری انہی چراغوں سے روشن ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جانا کہ وہ عقیدے کی شاعری نہیں کرتے، بالکل غلط ہے۔ بل کہ ان کے ہاں تو جہاں جہاں عقیدے کا اظہار رہوا ہے، پورے خلوص سے ہوا ہے۔ ایسے مرحلوں پر یوں لگتا ہے جیسے آئینے اور تلوار کی آب ایک ہوگئی ہے۔
یہاں ان کی اس نعت کی مثال دی جا سکتی ہے، جو انہوں نے حضورِ سرورِ کائناتؐ پیش کی ہے:

مرے رسولؐ کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے
نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے
تُو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے
ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے
یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تُو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے
مگر یہ مُفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو مُعتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے
خُدا کے نام کو بیچیں مگر خُدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خُدا کے نالوں سے
نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس
کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے
مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے
میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہُوں قبا و کلاہ والوں سے

اس نعت میں واعظانِ شہر کا شکوہ بھی ہے اور خراب حالوں کا تذکرہ بھی مگر شاعر نے کہیں بھی ستم گروں سے مصالحت نہیں کی ۔ ایک اور نظمیہ نعت ''میں اکیلا کھڑا ہوں'' میں تو عقیدتوں کے دریا موجزن ہیں ۔ یہاں بھی فقیہہ شہر سے سرکشی کا عنصر غالب ہے مگر ایمان کی حرارت لفظ کو لو دے رہی ہے ۔فراز کے ہاں خطیب و منبر پر ضرب تو پڑتی ہے مگر عقیدے پر آنچ نہیں آتی ۔ یہیں وہ شہیدانِ کربلا کے حضور نذرانۂ سلام پیش کرتے ہیں ۔

ان کی یہ نظمیں دیکھ کر اندازہ کیجیے کیا یہ عقیدے کی پختگی اور ایمان کی بلندی نہیں، کیا ایمان حضور اور اہلِ بیت کی محبت میں پوشیدہ نہیں ۔ کیا ظلم کے آگے سرکشی جزوِ ایمان نہیں یا چپ چاپ سروں کی فصلیں کٹا دینا ایمان ہے ۔عقیدے کی سرشاری لیے فراز کی یہ دونوں نظمیں میں اکیلا کھڑا ہوں اور سلام اُس پر دیکھیے :

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!
تری بارگاہِ معلیٰ میں
عصیاں کے انبار سے سرنگوں
اک گنہگار انساں کھڑا ہے
نہ اس کے بدن پر عبا و قبا ہے
نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے
نہ ماتھے پہ محراب داغ ریا ہے
یہ وہ بدمقدر ہے
جس کا بدن بارشِ سنگِ خلقت سے
غربال ہے

جس کی گردن میں طوق ملامت پڑا ہے
یہ زندہ گڑا ہے
یہ مجرم ہے
ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا
کہ جو تُو نے کاذب جہاں کو عطا کیں
یہ مجرم ہے
ان بے غرض جراُتوں کا
جو تُو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیں
یہ کہتا ہے
اے دائمی حکمتوں کے پیمبر
کہ انسان سارے برابر ہیں
ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے
یہ کہتا ہے
الفاظ سب سے مقدس ہیں
اور حرف کی روشنی سے
کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے
یہ سرکش
مقدر کو انساں کا رہوار کہتا ہے
آدم کو نقاشِ ہستی کا شہکار کہتا ہے
کیا کچھ یہ ظالم گنہگار کہتا ہے
اے روشنی کے پیمبر
یہ شوریدہ سر
حرف زن ہے
کہ محراب و منبر سے
فتویٰ گر و فتنہ پرداز دیں
حرفِ حق بیچتے ہیں
فقیہانِ مسند نشیں

حرصِ دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اِک اِک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں
پیمبر!
مجھے حوصلہ دے
کہ میں ظلم کی قوتوں سے
اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں
اکیلا کھڑا ہوں

☆☆

سلام اُس پر!
حسینؑ!
اے میرے سر بریدہ
بدن دریدہ
سدا ترا نام برگزیدہ
میں کربلا کے لہو لہو دشت میں تجھے
دشمنوں کے نرغے میں
تیغ در دست دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں
کہ تیرے سارے رفیق
سب ہمنوا
سبھی جانفروش
اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں
گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے
چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں

مسافرانِ رہِ وفا لُٹ لٹا چکے ہیں
اور اب فقط تُو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارۂ صبح کی طرح
روشنی کا پرچم لیے کھڑا ہے
یہ ایک منظر نہیں ہے
اِک داستاں کا حصہ نہیں ہے
اک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے
میں آج اسی کربلا میں
بے آبرو نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسین کل سرخرو گیا ہے
میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عز و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے
سلام اُس پر
سلام اُس پر

کربلا فراز کے ہاں ظلم و جبر کے آگے نہ جھکنے کا نام ہے ۔ایک جدوجہد ہے، ایک فیصلہ ہے، ظلم کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے کا ۔وہ جو کائنات کے امین اور وارث ہیں، فراز انہیں عقیدت کا مرکز مانتا

ہے اور اُس کا قلم انھی ہستیوں کے حضور سر بسجدہ ہوتا ہے۔

ان کی نظم سیّدالشہدا ابھی شہیدانِ کربلا کے حضور ایک شاعر کا نذرانۂ خلوص ہے۔ یہ ہستیاں ظلم کے خلاف جنگ میں شاعر کے لیے مینارۂ جہد ہیں۔ وہ انھی روشنیوں کی سیدھ میں چلتا ہے اور انھی کی وجہ سے اسے سفر میں سرخروئی سے نوازا جاتا ہے:

سیّدالشہداء

دشتِ غربت میں صداقت کے تحفظ کے لیے
تُو نے جاں دے کے زمانے کو ضیا بخشی تھی
ظلم کی وادیٔ خونیں میں قدم رکھا تھا
حق پرستوں کو شہادت کی ادا بخشی تھی
آتشِ دہر کو گلزار بنایا تُو نے
تُو نے انسان کی عظمت کو بقا بخشی تھی

اور وہ آگ وہ ظلمت وہ ستم کے پرچم
تیرے ایثار ترے عزم سے شرمندہ ہوئے
جرأت و شوق و صداقت کی تواریخ کے باب
تری عظمت، ترے کردار سے تابندہ ہوئے
ہو گیا نذرِ فنا دبدبۂ شمر و یزید
کشتگانِ رہِ حق مر کے مگر زندہ ہوئے

لیکن اے سیّدِ کونین حسینؑ ابنِ علیؑ
آج پھر دہر میں باطل کی صف آرائی ہے
آج پھر حق کے پرستاروں کا انعام ہے دار
زندگی پھر اُسی وادی میں اُتر آئی ہے
آج پھر مدِ مقابل ہیں کئی شمر و یزید
صدق نے جن کو مٹانے کی قسم کھائی ہے

دل کہ ہر سال ترے غم میں لہو روتے ہیں
یہ اسی عہدِ جنوں کیش کی تجدید تو ہے
جاں بکف حلقۂ اعدا میں جو دیوانے ہیں
اُن کا مذہب ترے کردار کی تقلید تو ہے
جب سے اب تک اسی زنجیرِ وفا کا رشتہ
بیعتِ دستِ جفا کار کی تردید تو ہے
☆☆☆☆

احمد فراز: ''میں کیوں لکھتا ہوں''

یقین مانیے جوں جوں وقت گزر رہا ہے میں اس بات کا قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ شاید مجھے نہیں لکھنا چاہیے مگر میں لکھے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ لکھنا میرے لیے زندگی ہے، میں نے جتنا بھی لکھا، دام اور نام کے لیے نہیں لکھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اپنی شاعری کی بدولت شہرت بھی حاصل کر لی۔ میرے خیال میں جو لوگ پیسے اور نام کے لیے لکھتے ہیں، وہ اکثر و بیشتر ان دونوں چیزوں سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ ان خواہشوں کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی شاعری بھی بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔

میں اپنے بارے میں بھی اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اگر شاعری میرے لیے شہرت اور دولت کا ذریعہ نہ بنتی تو شاید میں زیادہ بہتر لکھ پاتا کیوں کہ پیسہ انسان کو آسائشوں میں ڈال دیتا ہے اور کئی پریشانیاں جو تخلیقی عمل کا باعث بنتی ہیں، ان کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر میں نے مشکلات کا سامنا نہ کیا ہوتا اور تنگدستی کا زمانہ بسر نہ کیا ہوتا تو شاید میں ''صراف'' جیسی نظم نہ لکھ سکتا۔ ایسی ہی میری کئی نظمیں اور غزلیں اور بھی ہیں، جنہیں خوشحالی کے دور میں لکھنا ممکن نہیں تھا۔ تنگدستی کے دنوں کی مہک میں بسی ہوئی میری یہ غزلیں اور نظمیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ اگر یہ نظمیں اور غزلیں میرے ساتھ نہ ہوتیں تو اپنی شاعری کے ذریعے غربت، نا انصافی اور استحصال کے خلاف اتنی طویل جنگ کیسے لڑ سکتا تھا۔ خوشحالی کے اس موضوع کے حوالے سے اپنا ایک شعر میرے ذہن میں آ رہا ہے:

فراز تم نے اُسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو

میرا خیال ہے میں نا انصافیوں، ناہموار زندگی کی مشکلات، غربت کے خلاف اور عشق، جمال اور امن کے جذبوں کی آبیاری کے لیے لکھتا ہوں۔ محبت ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت لکھا گیا ہے لیکن ایک وقت وہ بھی تھا جب لوگ عشق کے بارے میں صاف طور پر نہیں لکھ سکتے تھے۔ تو وہ عشق کے اوپر تصوف کا پردہ ڈال دیا کرتے تھے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

برائے شعر گفتن تصوف خوب است

لہٰذا یہ عشق بے زبان تھا۔ میں نے اپنی شاعری میں عشق کو قوتِ گویائی عطا کی اور اس کی

زبان میں وہ روانی پیدا کی جس نے اس لازوال جذبے کی خوبصورتیوں کو نمایاں کر دیا۔ میں نے جان، زندگی، دماغ اور دل پر بیتی وارداتوں کو پوری دیانتداری سے رقم کیا ہے۔

لکھنے کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی خیال یا کیفیت مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ محبت کے بہت سے شیڈز ہیں۔ لوگوں سے، وطن سے، کسی ایک شخص سے، اس لیے میں اکثر لفظ ''محبتیں'' استعمال کرتا ہوں۔

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تم کو نہ آئیں محبتیں کرنی

جب میں نے نظم ''محاصرہ'' لکھی تو اس پر میں وطن بدر بھی کیا گیا، اس وقت وہ جذبہ، وہ کیفیت اپنی پوری شدت کے ساتھ مجھ پر حاوی تھی۔ جتنی دفعہ میں نے سگریٹ چھوڑنے کی کوشش کی ہے اتنی دفعہ میں نے شاعری چھوڑ دینے کا بھی سوچا ہے لیکن سگریٹ چھوٹے اور نہ ہی شاعری:

ہم بھی شاعر تھے کبھی جانِ سخن یاد نہیں
تجھ کو بھولے ہیں تو دلدارئ فن یاد نہیں

کبھی ایسا ہوا کہ مجھ پر تنگ سالی کے زمانے بھی آئے اور شاعری کسی پیارے کی مثال مجھ سے روٹھ گئی۔ شاعری میری حقیقی محبت ہے اور میری شاعری ایک زمانے تک میرے پہلے پیار کی دین رہی ہے۔ میرے نزدیک محبت کی کامیابی وصال نہیں ہے مل کر بچھڑنا میرے لیے تخلیقی تحریک کا باعث بنتا ہے اور شاعری وجود میں آتی ہے۔ میں نے کہیں لکھا ہے:

وفا پہ سخت گراں ہے ترا وصالِ دوام
کہ تجھ سے مل کے بچھڑنا مری تمنا تھی

اور یہ بھی کہ

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تُو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

فنکار حساس ہوتا ہے اور ہر جذبے کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ میں جذباتی ہوں، میرے اندر ہر جذبہ رونا، ہنسنا، محبت کرنا، نفرت کرنا شدت کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی کچھ وجہ میرا شاعر ہونا بھی ہے اور کچھ پٹھان ہونا بھی۔ میری شاعری جذبوں کی کیمیاگری ہے۔ میں جس شدت سے محبت کرتا ہوں، اسی شدت سے لکھتا ہوں۔ موضوع کوئی بھی ہو محبت، وطن یا طبقاتی کشمکش۔ ہر موضوع کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے کے علاوہ فنی ریاضت کی بھٹی میں ڈھالنا بہت ضروری ہوتا ہے لیکن شاعر کے لیے بہت ضروری ہے کہ آواز اونچی نہ ہو، وہ کسی نے کہا ہے نا:

آ کھسوتی مائے اونہوں روئے بُل چتھر کے ٹی

جگ کتھے سَن نہ لوے

میں اپنے جذبوں کی شدت کی طوفانی لہروں کا رُخ فن کے سمندر کی تخلیقی گہرائیوں کے طرف موڑنے کے لیے طویل ریاضت سے گزرتا ہوں۔ میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ ہمارے کئی شاعر ایسی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں جو ان پر کبھی گزری ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ وہ مانگے تانگے کا عشق کرتے ہیں اور مانگے تانگے کے انقلاب یا فاقے کی بات کرتے ہیں۔

انسان تین چیزوں سے سیکھتا ہے، مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ۔ ظاہر ہے ہر تجربہ آپ پر گزرا نہیں ہوتا، لیکن آپ کو لگتا ہے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میری شاعری میرے تجربے، میرے مشاہدے اور میرے مطالعے کی تفسیر ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ فخر کی بات سمجھی جاتی تھی کہ فلاں شخص لکھا پڑھا نہیں ہے اور پھر بھی اچھے شعر لکھ سکتا ہے اور اب یہ لفظ توصیفی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے۔ اب ہر تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ اور فرہنگ وسیع ہو لیکن ساتھ ہی میں یہ اضافہ بھی کروں گا کہ صرف لمبی چوڑی فرہنگ اور علم رکھنے والا اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ ورنہ لغت لکھنے والے آج سب سے بڑے شاعر اور ادیب ہوتے۔ ہمارے ایک پروفیسر تھے جو فارسی، انگریزی اور اُردو تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے مگر شاعری کا ایک لفظ نہیں لکھ پاتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اندر سے شاعر نہیں تھے۔

مجھے اپنے اندر کی کائنات اور باہر کی کائنات دونوں محرکات لکھنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں لیکن اگر ماحول میں دھواں ہو تو آپ کھانسیں گے اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلے گا۔ اسی طرح اگر آپ کے اردگرد خوشبو ہے تو آپ کو فرحت محسوس ہوگی۔ میں بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے جب لوگ میری نظموں اور غزلوں کی تعریف کرتے ہیں۔ حوصلہ افزائی اچھی چیز ہے اور آپ کو مزید لکھنے کی طرف راغب کرتی ہے۔ میں جب بھی کوئی نظم یا غزل لکھتا ہوں تو یہی سوچتا ہوں کہ اس سے بہتر چیز بھی شاید میں لکھ سکتا ہوں۔ یہی جستجو، تلاش، امید اور طلب مجھے مزید لکھنے پر مجبور کرتی ہے، کیوں کہ کوئی بھی کیفیت یا تخلیقی تجربہ اگر ارتقا پذیر نہ ہو تو اس کے رائیگاں ہونے کا خدشہ ہوتا ہے:

محبت ایک طغیانی ہے، وہ دل ہو کہ دریا ہو

وہ لوگ جن کا شاعری میں کوئی نصب العین نہیں ہے۔ شاعری کو صرف تفریح Entertainment کی حیثیت سے لیتے ہیں کہ بس واہ واہ ہو جائے تو میں انہیں برا نہیں کہتا مگر میں ان کی قدر کرتا ہوں جو کسی سوشل یا پولیٹیکل پروگرام پر چلنے اور لوگوں کے اصل مسائل کو ڈسکس کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر علامہ محمد اقبالؒ کو لیں ۔ کیا انہوں نے شاعری کے ذریعے ایک بڑا پیغام لوگوں تک نہیں پہنچایا ۔ انہوں نے اپنا سارا Message شاعری کے ذریعہ ہی دیا تھا ۔ تو آج کے مسائل جب کہ ہم زیادہ واضح طور پر دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ شاعر کسی خاص اور مثبت نظریے پر کام کرے ۔ میں ان چیزوں پھولوں، پہاڑوں دریاؤں وغیرہ پر شاعری کرنا زیادہ پسند نہیں کرتا ۔ یہ چیزیں مجھے بھی عزیز ہیں مگر میں زیادہ تر انسانیت پر سوچتا ہوں ۔ آج کل مسائل اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ایک شاعر چاہے بھی تو ان سے خود کو نہیں ہٹا سکتا ۔ مسائل ہر دور میں ہوتے ہیں، غالب کے عہد میں بھی تھے مگر پھر بھی اس دور میں اس قدر نہیں تھے اور نہ ہی دنیا کے دوسرے مسائل سے لوگ آج کی طرح بہرہ ور ہو سکتے تھے ۔ آج کے عہد میں تو خاک لینڈ کی اور فلسطین کی خبریں چند لمحوں میں پہنچ جاتی ہیں ۔ میں کمٹمنٹ کا شاعر ہوں ۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں تاہم جو بھی شخص جو بھی نظریہ میرے خیالات کو آگے بڑھانے میں اور لائن آف ایکشن دینے میں مدد کرے تو اس سے کچھ وابستگی تو ہو جاتی ہے ۔ ہمیں دنیا میں ہو بہو اپنے خیال جیسی چیز نہیں مل سکتی لیکن اگر کوئی ملتی جلتی چیز بھی ملے تو قدرتی طور پر رغبت اسی سے پیدا ہوگی اور ہم اس سے وابستگی اختیار کرنا پسند کریں گے ۔

ادب کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے ۔ جس ملک میں ادب سے احترام اور لگاوٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ قوم اپنی پستی کی طرف مائل ہو جاتی ہے ۔ دنیا کی ترقی یافتہ عوام کو دیکھ کر اندازہ کریں وہ لوگ پارکوں میں ہوں، ٹرینوں میں کتابیں ان کے ہاتھ میں ہوتی ہیں ۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبار وہ کام نہیں کر سکتے جو ادب کرتا ہے ۔ ادب آپ کے ذہن کی پرتیں اور دروازے کھولتا ہے ۔ شعر کی دو لائنیں ہی ہوتی ہیں مگر ان دو لائنوں میں وہ کچھ ہوتا ہے جو کسی ضخیم سے ضخیم کتاب میں نہیں ملتا ۔

ادب میں غفلت میں گناہ سمجھتا ہوں ۔ اگرچہ آزادی سے اب تک کبھی بھی ادب آزاد نہیں رہا ۔ ہمیشہ سے افکار پر بندش رہی ہے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا ہے اور نہ ہونے سے کچھ ہونا میں بہتر خیال کرتا ہوں ۔

ہر دور میں ادب کی راہیں بدل جاتی ہیں اور جو لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں وہ ادب سے یا تو الگ ہو جاتے ہیں یا ایسا ادب پیش کرتے ہیں جس میں منافقت ہو اور پھر سستا ادب آ جاتا ہے اور عام آدمی دو چار آنے کا سستا ادب پڑھ لیتا ہے ۔ آج کل بھی ادب پر برا وقت آیا ہے مگر یقین ہے کہ جینوئن ادب میں دلچسپی کم تو ہو سکتی ہے مگر اسے ختم نہیں کیا جا سکتا ۔ سچا ادب ہمیشہ زندہ رہتا ہے بلکہ ادب ہوتا ہی وہی ہے جو سچا ہو ۔۔۔۔

بنیادی چیز تو سچائی ہے ۔ ادیب کو ہر صورت میں سچائی کا اظہار کرنا چاہیے ۔ ادیب کو یہ بات مناسب نہیں کہ وہ فرنیچر کے بارے میں سچ کہے اور پردوں کے بارے میں نہ بولے ۔ بعض لوگ ایک

چیز کے بارے میں سچ بولتے ہیں اور بعض کے بارے میں جھوٹ کہتے ہیں۔ میں صفائی نصف ایمان کا نہیں بل کہ مکمل صفائی کا قائل ہوں۔ سچائی میرے نزدیک نور ہے اور نور میں تقسیم نہیں ہوتی۔ ادیب کو چاہیے کہ جہاں اندھیرا ہو وہاں سچ کی شمع لے کر پہنچے اور امریکہ ہو یا روس سب کے بارے میں سچ کہنا چاہیے۔ میں سلیم احمد کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ادیب کو ہر حال میں سچ بولنا چاہیے بل کہ میں تو کہتا ہوں کہ نہ صرف ادیب بل کہ معاشرے کا ہر شخص سچ بولے۔ مثلاً پینٹر کو اپنے رنگوں میں سچ کہنا چاہیے اور اسی طور پر موسیقار کو اپنے ہر ساز میں سچ کہنا چاہیے۔

سچائی سب سے بڑی قوت ہے اور جب تک آدمی اس میں دیانت دار نہ ہوگا معاشرے کی ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالب اور اقبال پر کیا منحصر ہے کہیں بھی کوئی بالکل ایسی مثال نہیں ملتی۔ مثلاً شیکسپیئر کے بعد دوسرا شیکسپیئر پیدا نہیں ہوا مگر برنارڈ شا تو آیا......اور کون ہے جو برنارڈ شا کو بالشتیہ کہے۔ بڑی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں بل کہ صدیوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوتی ہیں مثلاً آئن سٹائن اور مارکس کو لیں۔ روس میں کتنے اسٹالن اور مارکس پیدا ہوئے ہیں یا ان کے ادبا چیخوف اور ٹالسٹائی کو لیں۔ موجودہ دور میں آپ کو روس میں ایسا کون سا آدمی مل سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کل کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد پھر کوئی اس قدر اور مرتبے کا ادیب پیدا ہو۔ یہی حال ہمارے یہاں کا ہے۔ ہر صدی میں ایک دو آدمی ایسے جنم لیتے ہیں۔ پہلے اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور پھر اسی شہر میں فیض پیدا ہوئے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہ سکتا ہے۔ ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ آج کل واقعی بالشتیے بہت ہو گئے ہیں مگر قد آور لوگ بھی بہت ہیں کیوں کہ ادب کو بہر حال ایک قد آور شخصیت کی ضرورت ہے۔

زندگی کا مقصد ضرور ہونا چاہئے۔ میری زندگی کا کبھی یہ مقصد نہیں رہا کہ میں کوئی بڑا عہدہ لوں۔ سیاسی لیڈر بنوں۔ کوئی سفیر یا وزیر بنوں۔ یہ مقصد کبھی نہیں رہا۔ میرا مقصدِ حیات ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں جو باتیں شعر کے توسط سے کہہ رہا ہوں تو لوگ اسے سمجھیں، اس کے قریب پہنچیں۔ میری یہ خواہش بالکل ایک باپ کی طرح ہے جس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے اچھا پڑھیں اور ان میں شعور پیدا ہو۔ مجھے جس دن یہ احساس ہو گیا کہ میری زندگی میری شاعری کا کوئی مقصد نہیں ہے میں اس روز شاعری ترک کر دوں گا۔

میں نے ہر جگہ یہی کہا ہے کہ میں نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا اور نہ کہیں اور میرا کچھ کنٹری بیوشن ہے مگر کچھ عزتِ نفس ضرور ہے۔ میں نے کئی پرائیویٹ اداروں میں بھی کام کیا ہے اور خیر سے کلیدی عہدوں پر رہا ہوں، وہاں کا ایک مزدور اور عام آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کبھی خود پسندی کے غرور میں مبتلا ہوا۔ میں ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ بلا امتیاز اتنی محبت سے رہا کہ جہاں سے گیا لوگوں نے یاد کیا۔ میری طبیعت کچھ ایسی ہے کہ میں ہمیشہ ایسے لوگوں میں خوش رہتا ہوں جو دوسروں کی نظر میں

چھوٹے اور غریب ہوتے ہیں۔ مجھ سے اکثر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ میں وزراء، جرنیلوں اور بڑے لوگوں میں کیوں زیادہ نہیں اٹھتا بیٹھتا اور کیوں ان کی تقریبات میں نہیں جاتا۔ خود پسندی تو وہ شخص کرتا ہے جو خود کو کسی سے بالاتر یا برتر سمجھتا ہو میں تو خود کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں بل کہ مجھے تو لوگ درویش آدمی کہتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض لوگ جب کسی فن کار سے ملتے ہیں تو مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن جب مجھ سے میرے مداح ملتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا، یہ اس لیے کہ شاعر فراز اور انسان فراز میں زیادہ فرق نہیں ہے اور میرا وہ حال ہے:

دل آئینہ ہے تو چہرہ کتاب جیسا ہے

اس لیے میں منافقت اور منافق لوگوں سے نفرت کی حد تک گریز کرتا ہوں۔ بہر حال جب تک میں سمجھوں گا کہ ابھی میں بہتر لکھ سکتا ہوں، لکھتا رہوں گا۔

معاصرین کی آرا

فیض احمد فیض

احمد فراز کے کلام میں خیال اور جذبے کا قالب اور شعری لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے، آپس میں پیوست ہیں۔ شاعر کو یہ بات جب نصیب ہوتی ہے، جب اس کے جذبہ اور اس کا فن دونوں یکساں، پرخلوص اور سچے ہوں۔ یہی خلوص، گداز اور سچائی احمد فراز کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اسی خلوص کی وجہ سے یہ حدیثِ دل کے علاوہ زندگی کے وسیع تر حقائق کا بیان بھی ویسی ہی خوبی اور لگن سے کرتے ہیں، بیک وقت غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی وسیع دنیاؤں سے آگہی اور اس کی مؤثر تفسیر مشکل کام ہے۔ احمد فراز اس کام میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

احمد فراز پاکستان کے ان معدودے چند فن کاروں میں ایک ہیں جو اُردو شاعری کے مستقبل کے امین ہیں اور جن کے بارے میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا فن مسلسل ارتقا پذیر رہے گا اور وہ اردو شاعری کی فنی روایت کو نہ صرف آگے بڑھائیں گے بلکہ ان روایات میں خوبصورت اضافے بھی کریں گے۔ خاص طور سے احمد فراز کے سلسلے میں یہ دعویٰ اس لیے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قدیم و جدید کے نہایت حسین اور دلآویز مرکب پر کامیاب تجربے کیے ہیں۔ ان کے کلام کا یہی وہ رُخ ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے اس عمر میں ہی اردو شعرا کی صفِ اول میں جگہ حاصل کر لی ہے۔

فراق گورکھپوری

احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک نئی اور انفرادی آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے وجدانی اور جمالیاتی شعور کی ایک خاص شخصیت ہے جو نہایت دلکش خدوخال سے مزین ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز نہایت حساس اور پُرخلوص ہے۔ ان کی شاعری کو صرف کلاسیکی یا رومانی شاعری نہیں کہا جا سکتا بلکہ دورِ حاضر کے لطیف ذہنی ردِعمل کا سچا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ صداقت کے نئے مقامات سے اپنی

باتیں کہتے ہیں اور یہ باتیں دعوتِ فکر دیتی ہوئی حد درجہ دلکش و دلنشیں ہیں۔ ان کا کلام اُردو شاعری کے نئے موڑ کے کئی نازک زاویوں کی لچک اور تھرتھراہٹیں اپنے اندر رکھتا ہے اور خیال کی ترتیب و تہذیب کا کافی سامان اس میں موجود ہے۔

مجروح سلطان پوری

فراز اپنے وطن کے مظلوموں کے ساتھی ہیں، انہیں کی طرح تڑپتے ہیں مگر روتے نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑتے، ٹکڑے بکھیرتے نظر آتے ہیں جو ان کے معاشرے کے جسم کو جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کا شعر نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی معیار کا ہے بلکہ ایک شعلہ ہے جو دل سے زبان تک لپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آئے فیض اور ن۔م راشد کے بعد مگر اساتذہ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک اچھا شاعر اپنے بعد آنے والوں کو راہ دکھاتا اور متاثر کرتا ہے۔ فراز کا شمار اب ان میں ہے۔ یہ ان کی پریشاں نفسی اور آتش زیر پائی ہے جو انہیں ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتی۔ دنیا کی کسی ادبی محفل میں جائیے آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے، کہ احمد فراز سے ملاقات ہو گئی۔ گویہ عالم ہیں اور آپ عالمی مسافر، بقول انہیں کے ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ:

میں نے جس جس کو بھی چاہا ترے ہجراں میں وہ لوگ
آتے جاتے ہوئے موسم تھے زمانہ میں تھا!!

قدرت اللہ شہاب

احمد فراز عوام کا شاعر ہے۔ وہ ایسے استعاروں میں بات کرتا ہے، جو خطابت اور تنگ نظرانہ قوم پرستی سے بالاتر ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں بین الاقوامی شاعر ہے اور اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کی نظمیں اس وقت سرتاسر عشق مملو ہوتی ہیں جب وہ بغاوت کرتا ہے، افسوس کرتا ہے یا الزام لگاتا ہے۔ وہ عوام پر تشدد برداشت نہیں کرسکتا، چاہے سیاسی لبادے میں ہو، وہ قابیل کو قبول نہیں کرسکتا۔

پروفیسر فتح محمد ملک

احمد فراز نے اپنا فنی سفر طلوعِ آزادی کے ساتھ اور ترقی پسند ادبی تحریک کے جلو میں شروع کیا تھا۔ شخص و شاعر ہر دو حیثیتوں میں فراز کی نمایاں ترین پہچان ترقی پسندی اور ادب سے اٹوٹ وابستگی میں پنہاں ہے۔ گزشتہ اہم صدی کے دوران احتساب و تعزیر کے خوف سے بے نیاز ہو کر اور ترمیم نظر کا شکار ہوئے بغیر احمد فراز نے ترقی پسندی سے تخلیقی وابستگی کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ لطفِ سخن اور قبولِ عام ہر دو اعتبار سے اس کے ہم سفروں کے لیے قابلِ رشک ہے۔ گرد و پیش کی زندگی کی ناہمواریوں اور سفاکیوں سے متعلق تلخ نوائی کے ساتھ ساتھ فراز نے ہمارے زمانے کی غنائی شاعری کو تہہ دار اور

پُرثروت بنایا ہے۔بعض عناصران دوکارناموں کو باہم متضاد قرار دیتے ہیں۔دل اور دنیا، غنائیت اور انقلاب سیاسی شعوراور جمالیاتی تجربہ کو متضاد اور متصادم سمجھنے کی غلطی نے مارکسی تنقید کے زیراثر رواج پایا ہے۔ورنہ ہمارے ہاں تو رئیس المتغزلین ہونے کے لیے سیّد الاحرار بننا پڑتا ہے مولانا حسرت موہانی کی زندگی اور فراق گورکھپوری کی تنقید شاہد ہے کہ ہماری تہذیبی روایت میں حریت اور غنایت ہمیشہ ہم قدم ہم تمنا رہی ہیں۔

گوپی چند نارنگ

فراز اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جس کی ہر دلعزیزی عشق ومحبت کے شدتِ احساس اور والہانہ پن کا استعارہ تھی۔لطفِ سخن اور قبولِ عام کو خداداد کہا گیا ہے،فراز اس کی شاید آخری مثال تھے۔پشاور کا ایک پشتو بولنے والا اردو شاعر اپنے رومان پرور لب ولہجے سے سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔جمالیاتی احساس کے وفور اور رومانی لے کی اثر پذیری سے فراز نے بہت سے فن کاروں کو اپنا گرویدہ بنا لیا پھر فیض کی مزاحمتی انقلابی میراث بھی بیش از بیش فراز ہی کے حصے میں آئی اور فراز کی شعری آواز، عشق ومحبت کی سرمستی اور کداختگی کے ساتھ ساتھ سیاسی جبر اور سماجی انصاف کے خلاف احتجاج کا نشان سمجھی جانے لگی۔ آج اردو کی محفل ان کے بغیر سونی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

فراز کی شاعری زندگی کے بارے میں ایک وسیع تر اخلاقی اور سیاسی نقطۂ نظر کی شاعری ہے۔ ہر چند کہ ترقی یافتہ معاشرے شاعری کے منصب کے بارے میں زوال آمادہ آرا فراہم کرتے رہے ہیں لیکن زندگی بے رحم ہے۔فراز کی شاعری بھی اپنی تمام تر خوابنا کی کے باوجود بے رحم ہونے پر تلی ہوئی ہے۔جس معاشرے سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہاں شاعری کے بارے میں Eliot اور Pound جیسے اشرافیہ پرست ناقدین کی آرا بے وقت کی راگنی معلوم ہوتے ہیں۔فراز جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں شعرا اور شاعری کی ذمہ داریاں بنیادی نوعیت کی ہیں۔شاعری کے ذمہ تعمیر اور تخلیق کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب کے صحت مند عناصر کی یکجائی بھی ہے،فراز کی شاعری نے بے شناختی کے گھپ اندھیرے میں وطن کے حسین در وبام کی تلاش اور ان کے ساتھ جس والہانہ وابستگی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے وہ ایک ایسے مصور کے حوصلہ تنگ وتازے مماثل ہے جو ہماری رگ وپے میں وطن کی محبت راسخ کیے جارہا ہے۔بہرطور یہ ایک حقیقت ہے کہ فراز کی شاعری کا وطن روز بروز نکھرتا جارہا ہے جیسے ہی آپ فراز کی شعری مملکت میں داخل ہوتے ہیں۔آپ یوں محسوس کرتے ہیں کہ وطن بہت بڑی حقیقت ہے اور شاعری اس حقیقت تک رسائی کا موثر وسیلہ ہے۔فراز نے بے شناختگی کے پتھروں سے ایک ایسی

Venus De Melo تشکیل کی ہے جو انتہائی پُر کشش ہے۔ جب شاعری اپنے وقت کی سب سے بڑی شناخت بننے لگےتو آپ بجا طور پر محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اندھیری رات کا سکوت دم توڑنے لگا ہے اور نحیف ونزار انسانوں میں ایک نئی طاقت کروٹ لینے لگی ہے ۔فراز کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کلاسیکی شاعری کی روایت کے اندر بھر پور زندگی گزارتے ہوئے بھی ، نئے حقائق کی صراحت کے لیےبھی موثر شعری اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

زہرا نگاہ

ہر فنکار اپنی راہ میں کسی فقیر کو ڈھونڈتا ہے مگر یہ فقیر ہر ایک کو نہیں ملتا۔اب سمجھ میں آتا ہے کہ فن کے راستے میں ایک دوراہا آتا ہے ،ناانصافی اور انصاف کا ،ایک موڑ آتا ہے سچائی کا۔جب شاعر اس دوراہے اور اس موڑ کا صحیح انتخاب کر لیتا ہے تب وہ فقیر اسے ملتا ہے۔جس کی دعا بارگاہ رب میں قبول ہو جاتی ہے اور پھر کئی آستانے شاعر کی جبیں کے لیے ترسنے لگتے ہیں۔

میں فراز کی شاعری اس دورتلاطم میں ایک نعمت سمجھتی ہوں۔اس گھٹن میں مہکی ہوا کا وہ جھونکا جو مشام جاں کو معطر کر دیتا ہے۔ایک ایسا احساس جو ویران آنکھوں میں چمک لاتا ہے چاہے وہ آنسوؤں ہی کی کیوں نہ ہو۔آیئے ہم ان سے کہیں کہ وہ ہم سب کا ہاتھ تھام کر ہم کو اس کارگہہ شیشہ گراں میں لے چلیں جو ان کے اشعار سے مزین ہے۔اس آئینہ خانے میں ہر شخص کو اپنا عکس نظر آئے گا اور یہی بلند پایہ شاعر کی خوبی ہے۔

سیّد ضمیر جعفری

ہم نے اپنے زمانے میں جن دو چار شعرا کو بچشم خود قطرے سے سمندر اور ذرے سے ''راکاپوشی'' اور ''کے ٹو'' وغیرہ بنتے دیکھا،ان میں احمد فراز ایک الگ تمکنت رکھتا ہے اور بیکن نے فراز جیسے شاعروں ہی کے لیے کہا ہے کہ ان کی خوبصورتی ہی ان کے لیے بہترین سفارشی خط ہوتی ہے۔فنی موشگافیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ فراز کی شاعری بیک وقت گلاب کا پھول بھی ہے اور آگ کا الاؤ بھی۔صوفیا کی طرح اس کی شاعری کا پیرہن ہلکا اور خیالات وزنی ہوتے ہیں۔وہ آنکھ کی شاعری بھی کرتا ہے اور دماغ کی بھی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی آنکھ والی شاعری زیادہ مرغوب ہے کہ یہ درخت کی طرح ،دل کی زمین سے اُگتی، ذہن میں مہکتی ، زندگی میں پھیلتی اور زبانوں پر پھلتی پھولتی چلی جاتی ہے۔

اس کی شاعری زندہ دلوں سے زیادہ مُردہ دلوں کے لیے ضروری ہے۔یہ تو انائی اور تنوع کے اعتبار سے مختلف ذائقوں کے پانیوں کا ایک وسیع سمندر ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ انسان کو کس ورجے سے

زندہ رہنا چاہیے۔ مجھے اس کی شاعری سے تسکین نہیں ملتی۔ خواہشات میں تحریک اور تجدید کا احساس ہوتا ہے۔ خون میں دفعتاً کچھ نئی چنگاریاں لشکارنے لگتی ہیں۔ اس کے فن میں ٹھہراؤ نہیں۔ ٹھہراؤ آئے بھی کہاں سے کہ وہ تو اب اس عمر میں بھی وہی اٹھارہ بیس برس کا لبرل، انقلابی انڈر گریجویٹ ہے۔ نوجوان ہے، جو دماغ سے کچھ آگے ہی چلتا ہے۔ کیوں کہ وہ ماضی کی تاریخ کے بجائے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعے سے نچلے معاشرتی طبقے کے آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فراز اس کے لیے اونچے طبقے میں جگہ خالی کروا رہا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنویت پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مصرعوں کو انگور کی بیلوں کی طرح تراشتا ہے تاکہ پھل زیادہ اُترے اور ذائقہ زیادہ ''سوادلا'' ہو۔ یہ تو اس کے فن کا اعجاز ہوا' جس نے اس کی شاعری کو شہد کی طرح میٹھا اور چائے کی طرح تیز اور پُر حرارت کر دیا ہے۔ فکر کے اعتبار سے اس کو دنیا کے ان شعرا کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے، جنہوں نے بنی نوع انسان کی غلامی کو کم کیا ہے۔

شمیم حنفی

احمد فراز فیض صاحب کے بعد ہمارے مقبول ترین شاعر ہیں۔ انہیں جیتے جی ایسی شہرت ملی ہے جو افسانہ بن جاتی ہے۔ ہمارے عہد کے عام جدید شاعروں کے برعکس فراز کی شاعری کا عقبی پردہ مغربی زبانوں کے ادب یا شعری ہیئتوں کے بجائے فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری نے مہیا کیا ہے۔ ان کی زبان و بیان میں فارسی غزل اور اردو کی کلاسیکی غزل کے رنگ صاف جھلکتے ہیں۔ پھر فراز کی شاعری میں کلاسیکی آداب کی پاسداری کے علاوہ انکار، احتجاج اور مزاحمت کا میلان بھی اپنے تمام معاصرین کے مقابلے میں زیادہ روشن اور تابناک دکھائی دیتا ہے۔ مزاحمت کی روایت جسے معاصر ادب (بالخصوص پاکستان میں تخلیق کیے جانے والے ادب) کی مرکزی روایت کا نام دیا جا سکتا ہے، اپنی سب سے مانوس اور معروف شکلوں میں فیض کے بعد حبیب جالب اور فراز کے یہاں رونما ہوئی مگر اس فرق کے ساتھ کہ جالب نے عوامی مقبولیت کے پھیر میں اپنے مزاحمتی رویے اور احتجاجی لہجے کی تہذیب پر کوئی توجہ نہ دی اور فراز کے یہاں زندگی اور شاعری کے مطالبات کی یکساں ادائیگی کا شعور ہمیشہ مستحکم رہا۔ فراز کے یہاں کلاسیکی دروبست اور شعر کے فنی محاسن کی فہم نے ان کے حرفِ احتجاج کو کبھی عریاں نہیں ہونے دیا۔ وہ سخت سے سخت بات بھی سنبھل کر کہنے کا گُر جانتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہجوم کی آواز اور اجتماعی طرزِ احساس کو طرح طرح کے رنگوں میں سامنے لانے کے بعد بھی فراز کا لہجہ ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے۔ صلابت اور نرمی کا، احتجاج اور افسردگی کا، شعور کی سنگینی اور گھلاوٹ کا ایسا امتزاج ہمیں اس عہد کے دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

برصغیر پاک و ہند کے گلوکاروں نے احمد فراز کی غزلیں کچھ ایسے والہانہ شوق سے گائی ہیں اور ان کی مترنم غزلوں کے بانکپن نے عام اہلِ ذوق کو ایسا گرویدہ بنالیا کہ ایک نظم گوشاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت اتنی روشن نہیں ہو سکی، جتنی ہونی چاہیے تھی۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ احمد فراز کو قدرت نے جس غیر معمولی تخلیقی ذہانت سے مالا مال کیا ہے اور ان کے فکر و تخیل کو جس نوع کے الوان و جہات عطا کیے ہیں ان کا مؤثر اور بھرپور اظہار غزل کے مقابلہ میں نظم میں ہی ہو سکا ہے۔ غزل کسی بسیط اور پہلو دار تجربہ کو بھی مجمل اور تعمیمی شکل دے کر پیش کرتی ہے۔ اس کے شعری حسن کا راز اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے۔ احمد فراز نے غزل کے اشاراتی امکانات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اسے روحِ عصر سے ہمکنار کیا ہے۔ نظم میں ان کا یہ طرزِ عمل زیادہ تخیلی وسعت اور فکری نیرنگی کا آئینہ دار ہے۔

میری میک انیلی (ممتاز امریکی شاعرہ اور نقاد)

احمد فراز عوام کا شاعر ہے اور استعاراتی اور پیغمبرانہ لہجے میں بولتا ہے، اس کی بصارت دلوں میں اتر جاتی ہے۔ وہ مقامی اور قومی تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے اور وہ سچے معنوں میں ایک بین الاقوامی شاعر ہے۔ ایک خالص انسان دوست ہے۔ خالص انسان دوست اس لیے کہ اس کی شاعری محبت کی شاعری ہے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ معاشرتی ناہمواریوں اور منفی انسانی قدروں پر طعنہ زن یا ماتم کناں ہوتا ہے جیسے وہ اپنی نظم پیغمبر کے حضور تحریر فرماتے ہوئے (آپ کا پیغام محبت تھا اور میرا دل تباہ حال لوگوں پر آنسو بہاتا ہے)۔ وہ عوام کے خلاف تشدد کو خواہ وہ کسی صورت میں ہو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی آواز سنیں وہ اپنی بات کرتا ہے، تمہاری بات کرتا ہے اور سب انسانوں کی بات کرتا ہے۔ وہ وجدان کا ایک بولتا ہوا شعلہ ہے۔ فراز وہ سب کچھ کہتا ہے جو ہم کہنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری آواز ہے۔

قیوم نظر

یہ کہنا کہ فراز ایک حساس نوجوان اور پُر خلوص انسان ہے اور یہ دونوں باتیں اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں شاید ایک ایسی سچائی ہے جس کے چہرے کی آب کو ہوائے زمانہ نے اگر دھندلایا نہیں تو سنولایا ضرور ہے۔ احساس میں شدت اور بیان میں خلوص تو ہر اچھے شاعر کی خصوصیات رہی ہیں، اس کے باوصف ایسے شعرا کو جب ان کو اپنے عہد کے شعور میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو ان کی امتیازی خصوصیات اس سے مختلف اور الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ فراز کو جب بھی ہم بیسویں صدی کے وسط کے ان گنت سلسلوں میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو وہ اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہنگاموں کے درمیان اپنے اکثر ہم عصروں کے برعکس ایک بھٹکا ہوا راہی نظر نہیں آتا۔ اس نے

پُرآشوب عہد میں قریب ودور ہر طرف دیکھا ہے اپنے لیے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

فراز کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ان کی غزلیں اس تمام کرب والم کی غمازی کرتی ہیں، جس سے ایک حساس رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ان کی نظمیں غمِ دوراں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں اوران کی کہی ہوئی بات ''جوسنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔''

مسعود مفتی

زندگی کے بارے میں فراز کا زاویۂ نظر ترقی پسندانہ ہے۔یوں تو ترقی پسند زاویۂ نظر ہر دور میں باعثِ کشش ہوتا ہے، خصوصاً نوجوانوں میں لیکن جب پچاس کی دہائی میں فراز نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تو ترقی پسند ادب کو قبول عام کا مقام بھی حاصل تھا۔پیشتر ادبی رسالے ترقی پسند نقطۂ نظر کے مبلغ تھے۔ادبی انجمنوں، تنقیدی محفلوں اور شعروسخن کی بزم میں ترقی پسند ادب وشعر کو پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔اس میں جدت کی چمک بھی تھی اور بغاوت کی کشش بھی۔اس لیے لکھا اور بولے حرف کی محفلوں میں موضوعی لحاظ سے فراز کی پُرجوش پذیرائی ہوئی۔یہاں یہ بات واضح کردوں کہ اپنی سوچ اور رویے کے لحاظ سے فراز ترقی پسند نقطۂ نظر کا حامل ہے لیکن اشتراکیت کا مبلغ نہیں۔وہ کسی سیاسی واقتصادی نظریے کی تبلیغ نہیں کرتا۔بہت سے لیبل زدہ ترقی پسند (عرف مارکسی) شاعروں کے برعکس وہ ترقی پسندی کا ایک جذباتی تصور رکھتا ہے، جو صرف سیاست پر ہی نہیں بل کہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔

عابد حسن منٹو

ہمارے عہد کے حالات جن سے فراز اور ہم سب پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے دوچار ہیں ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جن میں ایک طرف تو ریاستی جبر ہے۔جمہوریت اور انسانی حقوق کی پامالی ہے تو دوسری طرف استحصالی طبقات کی مسلسل بالادستی ہے۔سماجی اور معاشی انصاف مفقود ہے، رجعتی، مذہبی تاویلات اور فرسودہ رسم ورواج اس نظام کا نتیجہ بھی ہیں اور اس کے معاون بھی اور یہی سب کچھ فراز کی شاعری کا سیاق وسباق ہے۔

فراز کا شعری سفر ہمہ جہت ہے۔جہاں وہ احتجاج اور مزاحمت اور شعور عہد کا شاعر ہے وہیں وہ عشق ومحبت کے جذبات کی بھی نغمہ سرائی کرتا ہے۔فراز کے ہاں حسن وعشق کے مضامین روایتی انداز میں نہیں آئے اور وہ انفعالی رومانیت کا شاعر نہیں ہے۔محبوب کا بیان اور عشق کا اظہار اس کے ہاں تازگی اور زندہ انسانی رشتوں کی لطافتوں سے آراستہ ہے۔

ہرچرن چاولہ

میں نہیں جانتا کہ فراز کا مزاج خود ہی لڑکپن سے عاشقانہ تھا یا شوخ اور چنچل حسیناؤں نے انہیں لڑکپن اور معصومیت کے دور میں ہی ٹھونک بجا کر اور عشق کی راہوں پر ڈال کر بہت پہلے جوان بنا دیا تھا۔ مگر جب لوگ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ احمد فراز جب شاعری کی گھوڑی پر چڑھتا تو کئی گھوڑیوں ورگی چھوریاں دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگنے لگتیں اور اس بات کا زیادہ تو نہیں، کسی حد تک میں بھی آنکھوں دیکھا گواہ ہوں۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ہاں رام لعل نے ایک افسانے مطبوعہ بیسویں صدی نئی دہلی جس کا عنوان مجھے اب یاد نہیں آ رہا میں ایسی ہی کسی احمد فراز کے عشق کی ماری حسینہ کا ذکر چٹخارے دار لفظوں میں کیا تھا اور یہ میں بھی کہتا ہوں کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو اس کی تھانیدارانہ طویل و عریض اور خوبصورت وجاہت اور جسامت اسے ضرور کسی تھانے کا تھانیدار بنا دیتی۔

سریندر کور

فراز کی زیادہ تر شاعری طبقاتی فرق کے خلاف ہے، وہ ایسے لوگوں سے ملوا کر جو مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان امیروں سے جو انسان کو اشیا کی طرح استعمال کرتے ہیں، انسان کی آنکھوں پر سے پردے ہٹا دیتا ہے۔ اس کی شاعری کچلے ہوئے عوام کے دل کی آواز ہے۔ فراز ایک ایسا لکھاری ہے جس نے ایک مظلوم و مجبور معاشرے کی ہر برائی دیکھی ہے اور برداشت کی ہے لیکن اس کی روح پھر بھی سلامت رہی ہے۔ وہ بغیر کسی شک اور ہچکچاہٹ سے بار بار دہراتا ہے" لکھنے والے کی حیثیت سے یہ میرا مقدس فریضہ ہے کہ لوگوں کے مسائل کے بارے میں لکھوں۔ لیکن ایک منصفانہ اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کا انتظار اتنا طویل ہوتا جا رہا ہے، لگتا ہے جنت صرف شاعر کے تصور میں ہے۔''

خمار بارہ بنکوی

فراز صاحب کی راست گوئی ان کے کلام کی اہم شناخت بن گئی ہے۔ ان کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس خوبصورت اور دلکش امتزاج میں فراز صاحب کی شاعرانہ چابکدستی کا پورا پورا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ انہیں زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ شاعری کی مختلف صنفوں میں وہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ انہیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

رضا ہمدانی

سیّد احمد شاہ نے جس ماحول میں زندگی کا آغاز کیا، وہ ادبی ماحول تھا، ادھر ادھر شاعری کے چرچے تھے۔ پھر جس گھر میں اس نے جنم لیا اور پرورش پائی، وہ بھی شعری نعمت سے خالی نہ تھا۔ اس کے والد آغا محمد شاہ برق فارسی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ پشاور کی قدیمی ادبی انجمن بزمِ سخن پشاور کے سیکرٹری

تھے۔حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ''پیش ماہ نشیں کہ ماہ شوی'' کے مصداق احمد شاہ بھی اسی چاندنی میں کھو گئے اور جب اس چاند کی کرنوں نے اسے گدگدایا تو وہ احمد شاہ سے گوہرا اور پھر شرر برقی بن گیا۔ پشاور میں تازہ اور نووارد غزل سراؤں میں شرر برقی کا اپنے ہم عصروں میں خاصا چرچا تھا اور پھر اس کا ادبی قد آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوا۔شعور پختہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ شرر برقی نے اپنی کرنوں کی فراوانی سے اپنے عہد کے سینئر شعرا اور اساتذہ کو بھی چونکا دیا۔

ڈاکٹر توصیف تبسم

فراز کا شمار اُردو کے ان معدودے چند شعراء میں ہوتا ہے جو نظم اور غزل کہنے پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔وہ اپنی غزلوں کے بعض اشعار اور خصوصاً اپنی ایسی نظموں میں، جن میں وہ اپنی سرزمین اور تیسری دنیا کے محروم افراد کا ترجمان بن کر سامنے آیا ہے، شاعری کے سنجیدہ قاری کو دعوت فکر دیتا دکھائی دیتا ہے۔اس اعتبار سے اس کی شاعری کی تفہیم اور مقبولیت کی ایک سے زیادہ سطحیں ہیں اسی میں اس کی وسیع تر مقبولیت کا راز پوشیدہ ہے۔اس کے شعر کی مقبولیت کا ایک اور سبب فنِ شعر پر اس کی مکمل دسترس ہے۔ فراز کی غزل اور نظم اعلیٰ کرافٹ کا دل پذیر نمونہ ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت ان لوگوں کے لیے خاص کشش کا باعث ہے جو فن پارہ میں اظہار بیان کے لحاظ سے جمالیاتی حُسن کو مجسم دیکھنا چاہتا ہے۔

آفتاب اقبال شمیم

فیض اور جالب کے بعد جس شاعر سے خلقِ خدا نے ٹوٹ کر محبت کی ہے، وہ احمد فراز ہیں۔ خلقِ خدا کی یہ محبت نقارۂ خدا بھی ہے۔احمد فراز کی غزلوں میں جس طرح کی بے ساختگی ہے، اس کا یہ فکری اور نظریاتی رویّہ بھی انتہائی فطری اور بے ساختہ ہے۔وہ مابعدالطبیعات یا فلسفے کا شاعر نہیں۔وہ محبت یا محبتوں کا شاعر ہے لیکن وہ رومان پسند ہونے کے باوجود رومانی شاعر نہیں۔اس کی محبت میں شخصی تجربے کی آنچ بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔احمد فراز، فیض اور ندیم کی نظریاتی روش سے جڑا ہوا شاعر ہے۔آدمی کا احترام، جبر واستحصال کی تردید حق گوئی و بے باکی، مقتدر طبقوں کی مخالفت اور پسماندگانِ دہر کی حمایت ایسے موضوعات ہیں، جو احمد فراز کے بنیادی موضوع محبت یا محبتوں کے وفور میں جا بجا اظہار پاتے ہیں۔

ڈاکٹر احسان اکبر

احمد فراز اس عہد کی بیک وقت لطیف اور توانا آواز ہے۔ایسی آواز جسے آپ بڑی سہولت سے اپنے عہد کی علامت قرار دے سکتے ہیں۔فراز کا Bastion of Power اس کا فن ہے۔کس خوش سلیقگی سے وہ جگر خون کرتا ہے! کتنی تازگی سے لفظ کے مقام کا تعین کرتا ہے۔اور کیسے ہنر سے اسے تغزل

مآب کرتا ہے ۔امکان کے کن کن نا در گوشوں تک پہنچ کے ان کی تصویر لے آ تا ہے ۔یہ سب اس کی توفیق ہے ۔اچھی شاعری عوام میں مقبول ہو،یہ عموماً ہوا نہیں کرتا ۔مگر فراز خوش قسمت ہے کہ اس کے سلسلے میں یہ بھی ہوا ۔کیا یہ شاعری اپنے زمانے کی آ واز اور اپنے عہد کا استعارہ نہیں؟

عبیداللہ علیم

احمد فراز اپنے وقت کے بڑے مصروف اور مقبول شاعر ہیں ۔فیض کی روایت کو اپنے اسلوب میں زندہ رکھنا ایسا آ سان کام نہیں ۔انہوں نے یہ کام کیا ہے ۔شاعر کون سکھی گزرا ہے جو فراز سکھ اٹھاتے ۔انہیں ان کی نبرد آ زمائی کی داد نہ دینا کفر ہے۔

پروین شاکر

فراز اُردو ادب کا پرابلم چائلڈ ہے، اس سے سینئر یوں خفا ہیں کہ اس کی آ مد کے بعد کے نوجوانوں نے بزرگوں کی قبل از تاریخ تصنیفات کو سننے سے انکار کر دیا ہے ۔اس کے ہم عصر اس سے یوں نالاں ہیں کہ وہ اپنے سامنے ان کا چراغ جلنے نہیں دیتا ۔مشاعرے میں خوبصورت لڑکیوں کی محفل میں اس کے جونیئر کو گلہ ہے کہ فراز ہماری جدیدیت کا مضحکہ اڑاتا ہے اور شاعر جن کی روزی اور شاعری کا دارومدار مشاعروں پر ہے ،فراز سے یوں برگشتہ رہے ہیں کہ اگر کوئی سرکاری ادارہ بھی مشاعرہ کروا رہا ہو اور فراز کی کسی غزل سے پاکستان کی دو مشہور چیزیں خطرے میں پڑ رہی ہوں تو وہ وہاں غزل تو بے حد ضرر رساں جائے گا مگر انہیں اپنی سکرین بیوٹی سے مار دے جائے گا۔

اشفاق حسین

احمد فراز کی شاعری اپنے شہر کی دکھ بھری تاریخ ہے ۔کیلنڈروں پر چھپے ہوئے دن تاریخ اور مہینوں کے ہندسے بدلتے رہے لیکن شہر فراز کے المیوں میں کمی تو کیا اضافہ ہی ہوتا رہا اور یوں اس کے دکھوں اور غموں سے بننے والے گراف کے زاویوں کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف رہا ۔دکھوں اور غموں میں ہونے والا یہ اضافہ شہر فراز کے گلی کوچوں میں تاریکیوں کے تسلط کو مزید مستحکم کرتا رہا اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں کی بصارتیں ضائع ہو گئیں ،سارا شہر اندھا ہو گیا ۔

احمد فراز کی شگفتہ بیانی

غالب کی طرح فراز میں بھی کمال کی وِٹ پائی جاتی ہے،ان کی طبیعت میں بڑی شوخی تھی جوان کی ذہانت سے آمیز ہوکر بذلہ نجی کی شکل اختیار کرلیتی تھی۔کوئی بھی موقع ہووہ اسے ضائع نہیں ہونے دیتے تھےاور اپنے جملے کی شگفتگی اور بے ساختگی سے اسے یادگار بنادیتے تھے۔اس قسم کے جملوں سے ان کے ذہن کی براقی اور جودتِ طبع کا اندازہ ہوتا تھا۔

کسی محفل میں شان الحق حقی صاحب نے غالب کے مقابلے میں شیکسپئر کی تعریف کی جب کہ فراز غالب کے مکمل طرف دار۔تھوڑی دیر بعد کسی صاحب کے ذکر پر حقی صاحب نے فراز سے کہا میرے پاس ان صاحب کا ای میل ایڈریس نہیں ہے اگر آپ کے پاس ہوتو مجھے دے دیں۔فراز مسکراتے ہوئے کہنے لگے!حقی صاحب جس طرح آپ غالب کے بجائے شیکسپئر کے قائل ہیں اسی طرح میں بھی کسی ای میل ایڈریس کے بجائے صرف شی میل ایڈریس کا قائل ہوں۔

17اگست 1988 کی شام فراز صاحب حسب معمول ہالی ڈے اِن،اسلام آباد بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر اطلاع دی صدر پاکستان محمد ضیاءالحق طیارے کے حادثے میں شہید ہوگئے۔فراز صاحب نے برجستہ کہا؛اقبال کے اس شعر کامفہوم آج صحیح معنوں میں سمجھ آیا کہ''شہید کی جوموت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔''

ڈاکٹر شگفتہ فراز کہتی ہیں:

ماضی کے سندھی ڈراموں کے ایک اداکار،آج کے معروف پروڈیوسر جوکسی دستاویزی فلم کے سلسلے میں پشاور آئے ہوئے تھے،فراز صاحب سے ملنے آئے تو میں نے پہچانتے ہی کہا''ارے یہ تو منظور قریشی ہیں؟''احمد فراز برجستہ بولے:''مگراب تو یہ بے تحاشا موٹاپے کی وجہ سے نامنظور قریشی دکھائی دیتے ہیں۔''

عرفانہ امر کہتی ہیں:

12جنوری 2005،کونیشنل بک فاؤنڈیشن کے دفتر میں میرے علاوہ جناب ضیاءجالندھری، محسن احسان،ثمینہ راجہ اوراسلم راؤفراز صاحب کے ساتھ موجود تھے۔ضیاءجالندھری صاحب کی ایک

آنکھ میں پتھر لگا ہوا تھا اور ان کے گردے کا آپریشن بھی ہو چکا تھا۔فراز صاحب کہنے لگے دیکھیں جی ان کی نظر کا قصور نہیں ڈاکٹروں نے ان کے گردے سے پتھر نکال کر وہی ان کی آنکھ میں لگا دیا ہے۔جس پر محفل زعفران ہو گئی۔

انور مسعود صاحب کہتے ہیں:

کراچی کا ایک مشاعرہ جس میں میرے اور فراز صاحب کے علاوہ پروین شاکر بھی تھیں۔ پیرزادہ قاسم مترنم آواز میں اپنی مشہور غزل سنا رہے تھے ''خون سے جب جلا دیا ایک دِیا بجھا ہوا'' فراز صاحب نے برجستہ مصرع لگایا ''ایک دِیا لیا ہوا ایک لیا دیا ہوا'' اور پروین شاکر کو اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

یوسف رجا چشتی کے مطابق:

سالانہ امتحان میں ڈرائنگ کا پرچہ تھا۔امتحانی مرکز جاتے ہوئے راستے میں فراز کی ٹی(T) کہیں گر گئی تھی۔امتحان کے دوران ساتھی طالب علم سے فراز نے ٹی مانگی۔نگراں نے دیکھ لیا اور بزعم خود طنزیہ انداز میں سرزنش کی ''تم کیسے سپاہی ہو کہ بغیر تلوار کے جنگ کے لیے آئے ہوئے'' فراز نے برجستہ کہا ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' نگران نے لاجواب ہو کر دوسرے طالب علم سے کہا'' دوا سے جلدی دو ورنہ ابھی پورا شکوہ اقبال سنا دے گا۔''

اصغر ندیم سید کہتے ہیں:

ڈیرہ غازی خان میں پچیس روپے کا ایک مشاعرہ پڑھنے ،مَیں اور محسن نقوی پہنچے۔وہاں احسان دانش، قتیل شفائی ،عدم صاحب ،فراز صاحب ،سبھی بڑے شاعر موجود تھے۔عدم کی جب باری آئی تو محفل عروج پر تھی۔لوگ مسلسل انہیں داد دے رہے تھے۔عدم صاحب سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ کسی نے کہا عدم صاحب کرسی لا کر دیں۔فراز نے بلند آواز سے کہا انہیں کرسی کی نہیں آیت الکرسی کی ضرورت ہے۔

سید ضمیر جعفری کہتے ہیں:

فراز کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نیشنل سینٹر کی ہم دفتری کے زمانے میں ملا۔وہ مجھے اپنا ''برادر'' ہی معلوم ہوا کہ گویا ملازمت کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا مگر اس کو معمولات کا حیرت انگیز حد تک پابند پایا۔اس کی دفتری تحریر کے الفاظ روشن، مستحکم اور دوٹوک ہوتے۔انگریزی کے بیچوں بیچ اردو فارسی اشعار کا ترشح خشک دفتری مثلوں کو ایک ادبی چاشنی بخش دیتا۔محکمے کی ''کوارٹر ماسٹری'' میرے سپرد تھی۔ دفاتر کو......کاغذ قلم ،دوات ،میز کرسیوں سے لیس رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ایک مرتبہ فراز نے کچھ چیزیں طلب کیں۔میں نے لکھ بھیجا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

فائل پر چپڑاسی کے بواپسی ہاتھ لکھا ہوا جواب مِلا:

"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

گفتگو میں اس کے چٹکلوں اور پھلجڑیوں سے، جواد ب کی چاندنی سے تابدار ہوتیں دفتر کی فضا واقعی زعفران زار بنی رہتی۔ فراز کے پُر رعب "مشاعراتی آوازوں" سے تو ملک بھر کے ادبی حلقے واقف ہیں مگر اس کے معرکہ کے ادبی لطیفے جو دفتروں کی فائلوں میں ہی دفن ہو گئے، ان کی برجستگی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

اس کا پہلا مشاعراتی مجلّہ ہم نے ایبٹ آباد ہی کے مشاعرے میں سنا۔ حفیظ صاحب اپنی طویل نظم "رقاصہ" سنا رہے تھے۔ نظم ختم ہونے میں نہ آئی تو ناگاہ فراز کا آوازہ ابھرا ...... "حفیظ صاحب! اُٹھتر واں شعر مکرر ارشاد ہو" اور ...... اکتائے ہوئے سامعین کے قہقہے کا کول تک گونج گئے۔

لوگ حفیظ صاحب جیسے تنک مزاج سینئر شاعر کے ساتھ اس لڑکے کی جسارت پر حیران تو ہوئے مگر اس کی شکر آفرین ذہانت پر نہال اور ممنون بھی ہوئے۔

راحت ملک کہتے ہیں:

ایک رات میرے غریب خانے کے ایک کمرے میں محفل برپا تھی۔ فراز صاحب سبزی پسند کرتے تھے اور وہ بھی بھنڈی۔ چنانچہ ان کی آمد پر ہر کھانے میں میرے ہاں بھنڈی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ محسن احسان صاحب نے فراز صاحب کو ایک ڈش کی طرف متوجہ کیا تو کہنے لگے "چھوڑو یار آج مجھے صرف بھنڈی کھانی ہے چاہے میں بھنڈا ہی کیوں نہ ہو جاؤں۔"

بلراج کومل کہتے ہیں؟

احمد فراز روزِ ابر اور شبِ مہتاب کے علاوہ بھی کیف و مستی کے لمحات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ مارلیش کی محفلوں میں وہاں کے میزبان اکثر و بیشتر انتہائی اعلیٰ قسم کے برانڈ مہمانوں کی خاطر داری کے لیے پیش کرتے تھے۔ ایک آدھ بار ایسا ہوا کہ میزبان نے میز پر جو شے سجائی وہ اس معیار سے کچھ نیچے کے نام اور برانڈ کی تھی یعنی "بلیک لیبل" کے بجائے "ریڈ لیبل" تھی۔ احمد فراز کے چہرے پر سوالیہ شکن دیکھ کر میں نے پوچھا کیا ہوا؟ آخر "بلیک لیبل" اور "ریڈ لیبل" میں کیا فرق ہے۔ احمد فراز نے برجستہ جواب دیا: وہی فرق جو جگر مرادآبادی اور بسمل اتساہی میں ہے۔ ایک اجتماعی قہقہہ فضا میں لہرا گیا۔

ڈاکٹر توصیف تبسم کہتے ہیں:

فراز کے پشاور کے حلقہ میں ایک صاحب یوسف لودھی ہیں، جن کو تحریر و تقریر میں صحت لفظی اور املا کی درستی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ گرمی کے دن تھے، فراز دوپہر کا کھانا کھا کر تقریباً سو رہے تھے کہ

یکا یک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ جی تو چاہا کہ یونہی لیٹے رہیں، گھنٹی بجتے بجتے خود ہی بند ہو جائے گی مگر جب گھنٹی بند نہیں ہوئی تو عافیت اسی میں سمجھی کہ اٹھ کر بات کر لی جائے۔ جو نیند خراب ہونی تھی وہ تو ہو چکی۔ رسیور اٹھایا تو آواز آئی: میں یوسف لودھی بول رہا ہوں، ایک الجھن تھی اس لیے تمہیں فون کیا۔ فرازؔ نے کہا! فرمایئے: لودھی صاحب نے کہا! بس اتنا بتا دو کہ یہ جو قہقہہ کا لفظ ہے وہ ''قلم'' والے کاف سے ہے یا ''کتے'' والے کاف سے (اہل پنجاب کے یہاں 'ق'، 'ک' کے مخزن میں کوئی فرق نہیں)۔ فرازؔ نے جل کر کہا یوں تو قہقہہ قلم والے ''کاف'' سے ہے اگر یہ قہقہہ تمہارا ہے تو پھر کتے والے ''کاف'' سے ہے۔

اسی طرح کچھ عرصہ پہلے فرازؔ کی ملاقات نیو یارک میں سید محمد جعفری کے صاحبزادے جاوید جعفری سے ہوئی تو اس نے پوچھا: فراز صاحب، یہ جو ''غزال ختن'' کہتے ہیں، اس میں لفظ ''ختن'' کا درست تلفظ کیا ہے۔ ''خُتن یا ختن''۔ فرازؔ نے جواب دیا کہ اگر ہرن مسلمان ہو تو ''ختن''۔

جن دنوں فرازؔ ریڈیو پاکستان پشاور میں بطور اسکرپٹ رائٹر ملازم تھے، باقی صدیقی اور پشاور کے بزرگ شاعر، سید ضیا جعفری جن کی رباعیات کا مجموعہ ''صبوحی'' کے نام سے شائع ہوا، فرازؔ کے ساتھ اس شعبہ سے متعلق تھے۔ ضیا جعفری جب کوئی تقریر وغیرہ لکھتے تو فراز سے کہتے: فراز! ذرا اس کی ''کا''، ''کی''، ''کے'' دیکھ لینا۔ عاشورہ کے دنوں میں ضیاء صاحب نے ''شہادت عظمیٰ'' کے موضوع پر تقریر کرنی تھی۔ انہوں نے تقریر لکھی اور حسبِ معمول فراز کو دے دی کہ ذرا اس کو دیکھ لو۔ فرازؔ کو جو شرارت سوجھی تو انہوں نے جہاں 'کا' تھا وہاں 'کی' کر دیا اور جہاں 'کی' تھا وہاں 'کے' کر دیا اور جہاں 'کے' تھا وہ 'کا' بنا دیا۔ اب تو ضیا جعفری اسکرپٹ لے کر مائک پر آئے تو کچھ اس قسم کی تقریر کی:

> ''محرم الحرام کی مہینہ، معاف کیجیے، کا مہینہ۔ تمام دنیا کا مسلمان نہیں 'کے' مسلمانوں کے لیے ایک متبرک اور حد درجہ محترم مہینہ ہے۔ یہ سانحہ جس کا نظیر بھی نہیں، جس 'کی' نظیر دنیا 'کے' تاریخ، معاف کیجئے، دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، ایک انتہائی دل گداز واقعہ ہے۔''

شمیم اکرام الحق کہتی ہیں:

دہلی میں جب شام بہار کے مشاعرے کے بعد سب شعرا بھارت کی سیاحت کا پروگرام بنا رہے تھے تو پرتو روہیلہ کی بیگم وطن واپسی پر مصر تھیں اور کسی طرح بھی رکنے پر تیار نہ ہوئیں تو پرتو روہیلہ نے فرازؔ سے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''یار! جی تو چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ رک جاؤں مگر کیا کروں مجبوری ہے۔'' فرازؔ حسب عادت مسکرائے اور بولے ''ناحق پرتو روہیلہ پر تہمت ہے مختاری کی' اور یہ تو سب جانتے ہیں پرتو روہیلہ کا اصل نام مختار علی خان ہے۔

ایک بار اسلام آباد کلب میں، میں اپنے بچوں کے ساتھ لنچ کر رہی تھی کہ فرازؔ ثمینہ پیرزادہ

اور ثمینہ رلیہ کے ساتھ داخل ہوئے، ملاقات ہوئی تو میں نے کہا" واہ! کیا کہنے، ایک چھوڑو دو دو ثمینا ئیں" کہنے لگے ہاں بھئی! دن میں تو ثمینا ئیں ہوتی ہیں شام کو مینا ئیں (مینا کی جمع) ہوتی ہیں۔فراز نے فوراً ثمینہ کا قافیہ ساغر والی مینا سے ملاتے ہوئے کہا۔

انبالہ میں ان کے ایک پرستار سردار جی نے انہیں اپنے گھر پر دعوت دی۔میرے ساتھ اجمل نیازی بھی ان کے ہمراہ تھے۔رخصت کے وقت سردار جی نے عزت افزائی کے لیے انہیں ایک تلوار پیش کی جس کی نیام بہت خوبصورت تھی۔فراز کہنے لگے" اب کیا میں اسے قلم بنا لوں۔" اجمل نیازی نے ازراہ احترام کہا۔لایئے مجھے پکڑا دیجئے۔فوراً بولے:" رہنے دو یار تم نے تو سرنڈر ہی کرنی ہے۔"

مسعود اشعر لکھتے ہیں:

1976ء پیکنگ کے ایک بڑے ہوٹل میں جو اس وقت بیجنگ نہیں بنا تھا۔ہماری پہلی صبح تھی اور ہم سب ناشتہ کر رہے تھے۔میں نے پیالی اٹھائی، چائے کا ایک گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر پیالی میز پر رکھ دی۔" اس میں تو چینی نہیں ہے۔" فرآز نے کہا: سامنے اتنے چینی پھر رہے ہیں کسی کو اٹھا کر ڈال لو۔

ثروت محی الدین کہتی ہیں:

فرآز ایک مرتبہ میریٹ ہوٹل میں شام غزل کے بعد مہدی حسن کو اپنے گھر لے گئے چند اور دوست بھی ساتھ تھے، گھر پہنچ کر کچھ دیر بعد مہدی حسن سے کہنے لگے، کسی زمانے میں کھاتے پیتے گھرانے ہوا کرتے تھے لیکن اب کھاتے گھرانے الگ ہیں اور پیتے گھرانے الگ، اس لیے کھانا کھانے کے لیے ثروت اور ضیا کے گھر جائیں گے۔

منشا یاد لکھتے ہیں:

گزشتہ برس ایک روز وہ محبوب ظفر کی معیت میں میری بیمار پرسی کرنے آئے تو پوچھا کیا ہوا تھا۔میں نے بتایا کہ نبض سست اور بے قاعدہ چلتی تھی۔کہنے لگے تم سگریٹ پیتے ہو نہ شراب۔دل کو سست تو ہونا ہی تھا۔میں نے کہا آپ نے شاید یہ بات مذاق میں کہی ہے لیکن میں سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں کہ میں سموکنگ نہ چھوڑتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔کہنے لگے میں نے شاید نہیں سچ مچ مذاق کیا ہے، یہ چیزیں دل کے لیے کبھی اچھی نہیں ہوسکتیں۔ہاں البتہ نبض سست پڑنے کی شکایت نہیں رہے گی، کیوں کہ بندہ ہوگا تو نبض چلے گی۔

ایک بار اسلام آباد ہوٹل میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔حفیظ جالندھری صاحب اپنا کلام سناتے ہوئے کہنے لگے، عزیزو توجہ سے سنو اور سن لو۔میری عمر اتنے برس ہوگئی ہے کیا پتا یہ آخری مشاعرہ ہو۔

فرازؔ صاحب نے کہا'' حفیظ صاحب یہ تو آپ نے پچھلے سال بھی کہا تھا۔''

فراز صاحب کے بے تکلف دوست خاطر غزنوی جب کچھ عرصے کے لیے چین جا رہے تھے، ایک روز فرازؔ صاحب سے کہنے لگے یار میں چین جا رہا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا بیوی بچوں کو اکیلے کیسے چھوڑ دوں۔ وہ فرازؔ کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ فراز کہنے لگے یہ تو بہت آسان کام ہے، بیوی کو میکے میں چھوڑ جاؤ اور بچے جس جس کے ہیں انہیں واپس کر دو۔

ایک بار احمد فراز، محسن احسان اور خاطر غزنوی کے ساتھ ہوائی جہاز میں کراچی جا رہے تھے۔ خاطر غزنوی کا پروگرام بعد میں بنا تھا اور ان کا ٹکٹ کسی اور کے نام سے تھا۔ دورانِ سفر موسم کی خرابی اور ایئر پاکٹس کی وجہ سے جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ ایئر ہوسٹس کے ہاتھ سے چائے کی ٹرے گر گئی، بعض لوگوں کا سامان نیچے آ گرا اور مسافر دعائیں مانگنے لگے۔ خاطر غزنوی بھی بے حد خوف زدہ ہو گئے، ایسے وقت میں بھی فرازؔ صاحب کے اوسان بحال اور شوخی قائم تھی، بولے'' یار تمہیں کیا فکر ہے، خاطر جمع رکھو اگر جہاز کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو مرے گا تو وہی جس بے چارے کے نام کا ٹکٹ ہے۔''

ایک بار تبلیغی جماعت والے آئے، فرازؔ صاحب باہر نکلے تو وہ خوش ہو کر ملے اور کہا ہر مسلمان سے کلمہ سننا ہماری تبلیغ کا حصہ ہے آپ بھی کلمہ سنا دیجئے۔ فرازؔ بولے!'' کیا تبدیل ہو گیا ہے؟''

سید ضمیر جعفری ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مختلف محکموں میں ملازمت کرتے رہے۔ فوج، سی ڈی اے، پاکستان نیشنل سنٹر، افغان مہاجرین کی بحالی کے ادارے میں اور اکادمی ادبیات پاکستان وغیرہ۔ ایک بار ان کی کسی نئی تقرری کی بات زیر بحث آئی تو فرازؔ کہنے لگے جعفری صاحب! اب بس کریں اب تو آپ کے مصنوعی دانت بھی گر چکے ہیں۔

ایک بار ضمیر جعفری ویگن سے گر کر زخمی ہو گئے۔ احباب ان کی مزاج پرسی کے لیے آنے لگے۔ معروف شاعر اور انشائیہ نگار اکبر حمیدی بھی مزاج پرسی کو آئے فرازؔ پہلے سے موجود تھے۔ اکبر حمیدی نے پوچھا، آپ ویگن پر چڑھتے وقت گرے ہیں یا اترتے ہوئے۔ ان کے جواب سے پہلے فرازؔ بول پڑے'' اس عمر میں آدمی چڑھتے ہوئے نہیں اترتے ہوئے گرتا ہے۔''

ان کے ایک دوست میاں غلام قادر سے روایت ہے کہ (ماہِ نو فراز نمبر) فراز صاحب نے ایک روز قصہ سنایا۔ کہنے لگے قاضی حسین احمد صاحب سے پرانی صاحب سلامت ہے۔ ایک روز قاضی صاحب فرمانے لگے کہ میں زاہد خشک نہیں چوری چھپے، فرصت کے لمحات میں فیض صاحب کے شیریں کلام سے مستفید ہو لیتا ہوں۔ میں نے عرض کی قاضی صاحب ہم میں اور آپ میں بڑا فرق یہ ہے کہ جو کام آپ چوری چھپے کرتے ہیں ہم برملا کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

فروغ ادب دوحہ کے مشاعرے میں ایک بھارتی شاعر عبدالمنان طرزی نے میرے اور وارث علوی کے بارے میں ایک ایک نظم پڑھی۔ کسی نے ان لفظوں کے بارے میں فرازؔ کی رائے پوچھی تو بولے: جس طرح انہوں نے ان میں ٹانکے لگائے ہیں اس سے تو طرزی کی بجائے کسی درزی کی لگتی ہیں" اس کے بعد شاعر موصوف کو بھی درزی کے نام سے یاد کرنے لگے۔

ایک بار معروف افسانہ نگار نیلوفر اقبال کے ہاں ادبی محفل تھی۔ احمد ندیم قاسمی ان دنوں انہی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تقریب میں بہت سے احباب مدعو تھے۔ میں شرکت کے لیے وہاں پہنچا تو علیک سلیک کے بعد احمد فرازؔ نے مجھے دیکھ کر فی البدیہہ کہا "اللہ کی مرضی تھی کہ منشا ءنہ رہا یاد۔"

ایک بار ایک نجی محفل میں جہاں احمد فراز بھی موجود تھے، کسی شاعر ادیب دوست نے منصورہ احمد پر کوئی فقرہ اچھال دیا جس کا قاسمی صاحب نے برا مانا، اس پر احمد فراز بولے" قاسمی صاحب آپ نے تو منصورہ کو بیچ سورہ بنا رکھا ہے۔"

کشور ناہید کہتی ہیں:

کراچی میں ایک دفعہ میں، ش فرخ اور فردوس حیدر، فرازؔ کے ہوٹل میں ملنے گئے۔ پوچھا کیا کھاؤ گی۔ ہم نے کہا" سینڈوچز"، فون کر کے روم سروس والوں سے کہا" آپ کچھ سینڈ بجھوا دیں، وچز میرے کمرے میں موجود ہیں۔"

سلیم شاہد (مرحوم) کے سامنے کے تین دانت سلامت تھے، باقی کے ٹوٹ چکے تھے، اُس کو دیکھتے ہی کہتے" لو یار آ گیا تین وکٹوں والا۔"

ایک دفعہ فراز کو اسلام آباد آنا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ ہم نے کہا چلو چائنیز ریسٹورنٹ میں چل کر سوپ پی لیتے ہیں۔ سوپ کے پیالے میں آخر میں ایک کنکر نظر آ گیا۔ ہم دونوں نے شور مچا دیا۔ وہ بے چارے لمنتیں کرتے رہے کہ دوسرے لوگ نہ سن لیں۔ جلدی سے ایک اور سوپ کا بھرا ہوا پیالہ لے آئے، ہم نے وہ سوپ بھی پی لیا۔ جب ہم اٹھ کر جانے لگے تو فرازؔ نے کہا۔" اب ہم آئندہ اپنا کنکر ساتھ لے کر آئیں گے۔"

طارق نعیم بتاتے ہیں:

ایک بار میں دو دن دفتر نہ آیا تو فراز صاحب کو میری ضرورت پڑ گئی مگر میں نہ ملا۔ دو دن بعد جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے یار تم کہاں تھے میں نے کہا سر میری آنکھیں خراب تھیں اس لیے دفتر نہیں آ سکا تو وہ فوراً بولے۔ یار آ جاتے اس دفتر میں آنکھوں کا کیا کام ہے۔

ایک دفعہ کوئی فوٹو گرافر ایک رسالے کے لیے ان کی تصویریں لینے آیا۔ دوران فوٹو گرافی اس نے کہا۔ سر ذرا سگریٹ سلگا لیجیے ایک پوز سگریٹ پیتے ہوئے بھی ہو جائے۔ فراز صاحب نے

کہا۔سگریٹ سلگا تو لیتا ہوں مگر یہ تصویر میرے ڈاکٹر کو مت دکھانا کیوں کہ اس نے سگریٹ منع کیا ہوا ہے۔محسن احسان جو وہاں بیٹھے تھے انہوں نے کہا۔تو آپ سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔فراز صاحب نے فوراً کہا میں دو چیزیں نہیں چھوڑ سکتا ایک سگریٹ اور دوسرے داڑھی۔

ایک دفعہ سنگِ میل کے نیاز احمد نے فراز صاحب کو فون کیا اور اُن سے کہا آپ اپنی خودنوشت کیوں نہیں لکھتے۔آپ اپنی آپ بیتی لکھیں اور اُس میں اُن تمام خواتین کا ذکر کریں جن سے آپ کے مراسم رہے ہیں تو میں آپ کو دس لاکھ روپے دوں گا۔فراز نے کہا۔نیاز صاحب یہ سودا نہیں ہو سکتا کیوں کہ بیس لاکھ تو وہ خواتین مجھے آپ بیتی نہ لکھنے کا دے رہی ہیں۔

معروف شاعر اور فراز صاحب کے دوست حلیم قریشی مشاعرے میں اپنی غزل سناتے ہوئے جب مقطع پر پہنچے جس کی پہلی لائن تھی کہ ''حلیم بچ میں بھی ایک لذت عجیب سی ہے''۔فراز صاحب نے برجستہ کہا حلیم صاحب ''ویسے لذت حلیم میں بھی عجیب سی ہے''۔

''زاویہ'' کی ایک تقریب کے اختتام کے بعد فراز صاحب، ثمینہ راجہ، طارق نعیم اور میں باہر گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے کہ ثمینہ راجہ نے کہا: ''فراز صاحب وہ دیکھیں میری نئی مشہور زمانہ گاڑی آ گئی ہے۔'' فراز صاحب نے برجستہ کہا: ''مشہور زمانہ یا رسوائے زمانہ۔'' ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا: ''اس کا رنگ بھی سیاہ ہے۔فراز صاحب پھر بولے: ''اور اس میں ہم سیاہ کار ہی بیٹھ سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

احمد فراز کا پاکستان اور پاکستان سے باہر آخری مشاعرہ

21 جون 2008ء کی ایک اداس کر دینے والی شام تھی، راولپنڈی کا لیاقت باغ لوگوں سے بھرا ہوا تھا، یہ محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی سالگرہ کا دن تھا۔شمیم حیدر سید اور ابن محمد رضوی نے اس شام سالگرہ کے حوالے سے ایک مشاعرے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جس کی صدارت احمد فراز کو کرنا تھی۔ پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے صدر مخدوم امین فہیم اور سینئر رہنما اور ممتاز قانون دان اعتزاز احسن مہمان خصوصی تھے۔ مشاعرے کے سامعین میں محترمہ کی دستِ راس محترمہ ناہید خان، صفدر عباسی اور معروف اینکر حامد میر بھی شامل تھے۔ رات گئے مشاعرے کا آغاز ہوا۔نشست فرشی تھی جس کے لیے ایک خوبصورت سٹیج بنایا گیا تھا مگر فراز صاحب کی خواہش کے مطابق ان کے لیے کرسی کا بندوبست کیا گیا۔ وہ واحد شخصیت تھے جو پورا مشاعرہ کرسی پر تشریف فرما رہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہو چکی تھیں اور عام انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت بن چکی تھی۔مخدوم امین فہیم وزیر اعظم بنتے بنتے رہ گئے تھے۔ایک اداسی اور مایوسی کی فضا تھی مگر لوگوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔پیپلز پارٹی کا روایتی کلچر نمایاں نظر آ رہا تھا۔فراز صاحب مسلسل ایک گہری سوچ میں گم تھے اس دن وہ فراز نہیں لگ رہے تھے جو عام طور پر مشاعروں اور محفلوں میں ہوا کرتے تھے وہ نہ زیادہ ہنس رہے تھے اور نہ ہی اس دن انہوں نے کسی پر کوئی جملہ کسا تھا اور نہ ہی مزاح کے رنگ میں کوئی بات کی بس ان پر ایک خاموشی طاری تھی گہری اور پر اسرار خاموشی۔کافی دیر کے بعد انہوں نے منظر نقوی سے کہا کہ طارق نعیم کو کہو کہ میرے قریب آ کر بیٹھے شاید اس لیے کہ وہ پندرہ بیس سال سے نیشنل بک فاؤنڈیشن میں ان کے پی آر او کے طور پر کام کرتے آ رہے تھے اور ایک محبت اور دوستی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔اور اس کے بعد پھر ایک خاموشی۔

شاعروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ دوسرے شہروں سے بھی شاعروں کو بلایا گیا تھا۔کوئی سیاسی بات نہیں ہو رہی تھی۔شعراء کے بعد پہلے مہمان خصوصی اعتزاز احسن نے اپنی ایک نظم پیش کی جو انہوں نے انہی دنوں لکھی تھی۔مخدوم امین فہیم نے بھی اپنا کلام سنانے پر اکتفا کیا لیکن ان کے بعد جب فراز صاحب کی باری آئی تو انہوں نے ایک جملہ کہا کہ میں تو اسی پیپلز پارٹی کو مانتا ہوں جو یہاں موجود

ہے اور یہی اصل پارٹی ہے اس کے بعد انہوں نے اپنا کلام پیش کیا اور سب سے پہلے اپنی یہ غزل سنائی جس کا مطلع تھا۔

اُس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

لوگوں نے حسب معمول اور کلام سننے کی فرمائش کی اور آخر میں فراز صاحب نے اپنی مقبول ترین غزل "یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں" پیش کی۔ مشاعرہ ختم ہوا رات کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ فراز صاحب کو اسی رات امریکہ جانا تھا۔ وہ اپنا سفری بیگ ساتھ ہی لائے تھے اور غالباً حامد میر انہیں ائر پورٹ پر چھوڑنے گئے تھے۔ مگر اس رات لیاقت باغ میں موجود ہزاروں لوگوں میں سے کوئی ایک بھی نہ جان سکا تھا کہ پوری اردو دنیا اور ان کا محبوب شاعر احمد فراز کا پاکستان میں یہ آخری مشاعرہ ہوگا۔

مشاعرے کے اختتام پر وہیں مشاعرہ گاہ سے امریکہ جانے کے لیے ائیر پورٹ روانہ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے امریکہ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹروں کی تنظیم 'اپنا'' کے زیر اہتمام واشنگٹن میں منعقدہ چار روزہ کنونشن میں شریک ہونا تھا۔ جس میں سماجی مذاکرے، پروفیشنل سیمینار اور محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کا احوال ان کے دیرینہ دوست اور ممتاز شاعر اشفاق حسین نے اپنی کتاب ''احمد فراز یادوں کا ایک سنہری ورق'' میں یوں بیان کیا ہے۔

آخری بار ان سے واشنگٹن کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی جو ان کی زندگی کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ مشاعرہ ۲۸ جون ہفتہ کے روز ہونا تھا جس کی صدر احمد فراز اور مہمان خصوصی گوپی چند نارنگ صاحب تھے۔ ''اپنا'' کی ادبی کمیٹی نے اس سال مجھے بھی کینیڈا سے اس مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔

جمعہ ۲۷ جون کی شام جب میں واشنگٹن پہنچا تو وہاں ہال میں بہت سے لوگ نظر آئے جن میں ایک طرف تو پاکستانی سفیر برائے امریکہ حسین حقانی تھے تو دوسری طرف وکلا تحریک کے روح رواں اعتزاز احسن تھے اور وہ دونوں اپنے اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے لیکن ادبی برادری کا کوئی بھی فرد اس وقت مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوا احمد فراز اور پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دیگر مہمان دوسرے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو کنونشن کی اصل جگہ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ میری بکنگ بھی وہیں تھی۔ ہوٹل میں چیک ان کرنے کے بعد جب میں نے ان حضرات کو فون کیا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا سو میں نے ان کے لیے پیغام ریکارڈ کروا دیا۔ دوسری صبح ابھی سو کر بھی نہ اٹھا تھا کہ احمد فراز نے فون پر دوستانہ انداز میں حکم دیا ''فوراً میرے کمرے میں آ جاؤ''۔ ان کے کمرے میں پہنچا تو وہاں افتخار نسیم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ احمد فراز مجھ سے ہمیشہ کی طرح بڑی محبت سے بغل گیر ہوئے۔ میں ان سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد مل رہا تھا۔ مجھے وہ بہت کمزور نظر آئے۔ ابھی وہ اپنی بیماری کے واقعے کا ذکر ہی کر

رہے تھے کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے۔ فراز صاحب نے کہا یار ان سے کہہ دو کہ وہ بھی یہیں آ جائیں۔ نارنگ صاحب نے کمرے میں آنے کے بجائے نیچے لابی میں ملنے کو کہا تاکہ کچھ دیر باہر گھوم پھر لیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نیچے لابی میں نارنگ صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران بہت سے لوگ جن میں زیادہ تر ڈاکٹر تھے اور اسی کنونشن میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے، احمد فراز سے آ آ کر ہاتھ ملا رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنی بیوی سے ملواتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کی بہت بڑی مداح ہیں اور اس کنونشن میں صرف اور صرف آپ کو سننے کے لیے آئی ہیں۔ خاتون نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور تصویر کھنچانے کے ساتھ ساتھ ان سے کہنے لگیں کہ آج کی صبح میری زندگی کی بہت خوبصورت صبح ہے، میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کو رات مشاعرے ہی میں دیکھ سکوں گی مگر حسن اتفاق دیکھیے کہ یہاں آپ کو اتنی نزدیک سے دیکھنے اور آپ سے ملنے کا موقع مل گیا۔ اسی دوران نارنگ صاحب بھی ڈاکٹر عبدالرحمان عبد کے ساتھ آ گئے اور طے پایا کہ آج کا دن بہت خوشگوار ہے لہٰذا باہر نکل کر کسی مناسب جگہ پر چائے پی جائے۔

احمد فراز، گوپی چند نارنگ اور ہم سب لوگ اپنے ہوٹل سے نکل کر باہر سڑک پر چلنے لگے۔ آج واشنگٹن میں موسم بہت اچھا تھا، بہت سارے لوگ جاگنگ کرتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ احمد فراز کو چلنے میں کچھ دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ان کے بولنے کے انداز میں بھی روانی نہیں تھی جو ان کی پہچان تھی۔ بعد میں ہم لوگ پیدل چلتے ہوئے اپنے ہوٹل سے دوسرے ہوٹل میں آئے جہاں کھانے اور مشاعرے دونوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔

مشاعرے کی نظامت میرے ذمے تھی جب کہ اس کے صدر احمد فراز اور پروفیسر گوپی چند نارنگ مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرے کی ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ اس میں اعتزاز احسن نے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی اور پورے مشاعرے میں اسٹیج پر بیٹھے رہے۔ یہ ان کا پہلا بین الاقوامی مشاعرہ اور احمد فراز کا آخری مشاعرہ تھا۔ سب سے پہلے میزبان ڈاکٹروں نے اس کے بعد واشنگٹن کے شعرا نے اپنا کلام سنایا جن میں خاص طور پر مونا شہاب، ڈاکٹر عبداللہ، اور شکیل آزاد شامل تھے۔ اس کے بعد امریکہ اور کینیڈا سے آئے ہوئے شاعروں نے اپنا کلام سنایا جن میں میرے علاوہ عمیرا رحمان، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر شہلا نقوی اور ڈاکٹر محمد شفیق شامل تھے۔ احمد فراز سے پہلے بیرسٹر اعتزاز احسن کو دعوت کلام دی گئی۔ مشاعرے کے صدر احمد فراز جب اپنا کلام سنانے آئے تو تالیوں کی گونج میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں آہستہ آہستہ اپنا کلام سنا رہے تھے اور میں نے ہی نہیں بل کہ سب نے محسوس کیا کہ اب ان کے پڑھنے کے انداز میں وہ روانی اور وہ جوش و ولولہ نہیں تھا جو

پہلے کبھی ہوا کرتا تھا اور یادداشت نے بھی کسی حد تک ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں کی فرمائش پر جب انہوں نے اپنی مشہور نظم محاصرہ سنائی تو سینکڑوں بار پڑھی ہوئی اس نظم کے بھی وہ کئی مصرعے بھول رہے تھے لیکن انہیں سٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ اور حاضرین دہرا رہے تھے۔ آخر میں مہمان خصوصی گوپی چند نارنگ نے ہمیشہ کی طرح شہد کی سی مٹھاس میں ڈوبی ہوئی زبان میں اردو زبان اور جنوبی ایشیا میں اس کے ثقافتی اثرات کے موضوع پر تقریر کی اور واقعی تقریر کا حق ادا کر دیا۔ مشاعرہ تقریباً صبح تین بجے ختم ہوا اور وہاں سے نکلتے نکلتے اور لوگوں سے ملتے ملتے چار بج گئے۔ ہم لوگ پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔

بہت سے لوگ اکثر کہتے ہیں کہ آخر اس عمر میں فراز صاحب کو اتنا سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ یہی تو ان کی زندگی تھی۔ اچھی شامیں اور اپنی پسند کے لوگوں سے ملاقاتیں ان کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری تھیں۔ ان کے بغیر فراز کی زندگی نہیں تھی۔

بہر حال ڈاکٹر عطیہ کے آنے سے پہلے ہماری گاڑی آ گئی اور ہم سب لوگ ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ فراز صاحب سے ایک بار گلے ملے مگر وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ثابت ہو گی۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع ملی کہ فراز صاحب تو بہت بیمار ہیں اور شکاگو کے ہسپتال میں داخل ہو چکے ہیں تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔ میرے حساب سے تو انہیں اس وقت پاکستان میں ہونا چاہیے تھا یا وہیں واشنگٹن میں ڈاکٹر عطیہ کے گھر پر ہونا چاہیے تھا بعد میں پتا چلا کہ چوں کہ ان کی سیٹ فوراً کنفرم نہ ہو سکی تھی لہذا وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس شکاگو چلے گئے تھے۔ جہاں ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ شکاگو میں افتی سے فون پر بات ہوئی تو اس نے تفصیل بتائی کہ وہ ابھی آئی سی یو میں ہیں اور ان کے ایک گردے نے بالکل ہی کام کرنا چھوڑ دیا ہے پھر بعد میں پتا چلا کہ وہ ۱۴ اگست کے روز ٹورنٹو سے پی آئی اے کی پرواز کے ذریعے اسلام آباد جائیں گے۔

شکاگو سے انہیں ٹورنٹو لایا گیا اور جب ایک ٹرمینل سے انہیں دوسرے ٹرمینل پر ایمبولینس کے ذریعے منتقل کیا جا رہا تھا تو مجھے آخری بار انہیں ائیر پورٹ پر دیکھنے کا موقع ملا۔ صرف دیکھنے کا موقع ملا کیوں کہ ان سے بات تو ہو نہیں سکتی تھی۔ اس ملاقات کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے قریب تھا۔ ان کے ساتھ ایک نرس اور ان کے بیٹے شبلی سفر کر رہے تھے۔ شبلی نے بتایا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں رہے ہیں مگر انہیں اس وقت بہت حیرت ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے احمد فراز کی آنکھوں میں تھوڑی سی جنبش ہوئی اور انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ آہستہ سے اٹھایا۔ کچھ دیر تک وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے رہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ اشفاق دیکھو میں نے ٹورنٹو آ کر تم سے اپنا کیا ہوا وعدہ نبھایا۔ یہ اپنے دور کے بہت خوبصورت شاعر سے میری آخری ملاقات تھی۔

احمد فراز کے منتخب اشعار

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس لیے
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

☆☆

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

☆☆

اختلافِ جہاں کا رنج نہ تھا
دے گئے مات ہم خیال ہمیں

☆☆

اب ترے ذکر پہ ہم بات بدل دیتے ہیں
کتنی رغبت تھی ترے نام سے پہلے پہلے

☆☆

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

☆☆

دشتِ غربت میں تمہیں کون پکارے گا فراز
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

☆☆

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

☆☆

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تُو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

☆☆

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہوگی
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

☆☆

فراز ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

☆☆

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دُکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تُو کرے
چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

☆☆

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

☆☆

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فراز ہم
بدنام یوں ہوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

☆☆

کیا قیامت ہے کہ جن کے لیے رُک رُک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

☆☆

بس اک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں

☆☆

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

☆☆

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

☆☆

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

☆☆

اب تو ضبطِ غم نے پتھر کر دیا ورنہ فراز
دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

☆☆

لاکھ بے مہر سہی دوست تو رکھتے ہو فراز
اُن کو دیکھو کہ جنہیں کوئی ستمگر نہ ملا

☆☆

فراز دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگرنہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

☆☆

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

☆☆

یاد آتا ہے تو کیوں اُس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دُکھا ہوتا ہے

☆☆

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسا بلا کا تھا

☆☆

تمام شہر ہے مقتل اُسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اُسی کو دعائیں دیتا ہے

☆☆

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

☆☆

ابھی ابھی وہ ملا تھا ہزار باتیں کیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا

☆☆

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا اُدھر دیکھے گا کون

☆☆

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

جو در پئے پندار ہیں ان قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

☆☆

پھر تُو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

☆☆

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اُس کو پلٹ آنا ہے

☆☆

فراز ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اس سے

☆☆

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشمِ تر سے نکلا تھا

☆☆

تھا کبھی لازمی نصابِ وفا
اب یہ مضمون اختیاری ہے

☆☆

عجیب رسم ہے جو صدرِ انجمن ہو فراز
وہ چاہتا ہے اُسے انجمن کہا جائے

☆☆

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

☆☆

جام و سبو کی آبرو اہلِ ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے فقیہہ و محتسب، شہر میں معتبر ہوئے

☆☆

اور پھر سب نے یہ دیکھا کہ اُسی مقتل سے
میرا قاتل مری پوشاک پہن کر نکلا

☆☆

کس کو بتلائیں کہ آشوبِ محبت کیا ہے
جس پہ گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

☆☆

یہ میں بھی کیا ہوں اُسے بھول کر اُسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا ہم سفر اُسی کا رہا

☆☆

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے اُسے تم بھی بھول جاؤ

☆☆

ان کے ملبوس میں پیوند مرے جسم کے ہیں
اور یاروں کی نظر ہے مری عریانی پہ

☆☆

یہ لوگ میری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
میں نے فراز خود کو پیمبر نہیں کہا

☆☆

تُو لاکھ فراز اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے

☆☆

دیکھا مجھے تو ترکِ تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اُسی کا تھا

☆☆

اُس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

☆☆

ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہمنوا نکلتی ہے

☆☆

اس سے پہلے کہ بے وفا ہو جائیں
کیوں نہ اے دوست ہم جدا ہو جائیں

اب کے گر تو ملے تو ہم تجھ سے
ایسے لپٹیں تری قبا ہو جائیں

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے فراز
کیا کریں لوگ جب خدا ہو جائیں

☆☆

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے

☆☆

مری زبان کی لکنت سے بدگمان نہ ہو
جو تُو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں

☆☆

گلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چپ رہا ستمِ ناروا کے ہوتے ہوئے

یہ قربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
ہے آشنا کی طلب آشنا کے ہوتے ہوئے

☆☆

اُسے فراز اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

☆☆

دوست پرسش پہ مصر اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

☆☆

ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فرازؔ
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

☆☆

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

☆☆

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

☆☆

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فرازؔ
خود سا گناہگار پیمبر لگے مجھے

☆☆

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اُسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اُس کا

ہمیں نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فرازؔ
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا

☆☆

غرورِ جاں کو مرے یار بیچ دیتے ہیں
قبا کی حرص میں دستار بیچ دیتے ہیں

یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خواہشوں کے لیے
تمام عمر کا پندار بیچ دیتے ہیں

ذرا بھی نرخ ہو بالا تو تاجرانِ حرم
گلیم و جبہ و دستار بیچ دیتے ہیں

☆☆

ہر ستم گر کے محبت بھرے لہجے پہ نہ جا
کبھی صحرا بھی تو دریا کی طرح ملتا ہے

☆☆

میں وہاں ہوں جہاں جہاں تم ہو
تم کرو گے کہاں کہاں سے گریز

کر گیا میرے تیرے قصے میں
داستاں گو یہاں وہاں سے گریز

☆☆

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اُس سے ہو رہے تھے الگ

☆☆

ہم خون میں نہلائے گئے تیری گلی میں
اور تُو کہ سرِ بام ستادہ بھی نہیں تھا

☆☆

تیری باتیں ہی سنانے آئے
دوست بھی دل ہی دکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

☆☆

شعلہ تھا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو
میں کب کا جا چکا ہوں صدائیں مجھے نہ دو

☆☆

اُس ایک شخص کی سج دھج غضب کی تھی کہ فرازؔ
میں دیکھتا تھا، اُسے دیکھتا تھا آئینہ

☆☆

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

☆☆

خود کو ترے معیار سے گھٹ کر نہیں دیکھا
جو چھوڑ گیا اُس کو پلٹ کر نہیں دیکھا

اب یاد نہیں مجھ کو فراز اپنا بھی پیکر
جس روز سے بکھرا ہوں سمٹ کر نہیں دیکھا

☆☆

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

☆☆

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

وداعِ یار کا منظر فرازؔ یاد نہیں
بس ایک ڈوبتا سورج مری نظر میں رہا

☆☆

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

☆☆

میں نے ستم گروں کو پکارا ہے خود فرازؔ
ورنہ کسی کا دھیان کہاں تھا مری طرف

☆☆

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

☆☆

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
اب ہو چلا یقیں کہ بُرے ہم ہیں دوستو

☆☆

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فراز
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

☆☆

نگاہِ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

☆☆

تُو نہ چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کا ہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سرا ہے، تو میں ہوں

☆☆

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فرازؔ
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جدا

☆☆

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

☆☆

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تُو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

☆☆

ذکر اُس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

☆☆

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

☆☆

ہم تو بدنامِ محبت تھے سو رُسوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلقِ خدا جانتی ہے

کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہگذر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

☆☆

وفا پہ سخت گراں ہے ترا وصالِ دوام
کہ تجھ سے مل کے بچھڑنا مری تمنا تھی

☆☆

کہاں ہے دوست کہ آشوب دہر سے میں نے
ترے خیال کی آسودگی بچا لی ہے

☆☆

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

☆☆

شمع کی لو تھی کہ وہ تُو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

☆☆

دشتِ غربت میں تمھیں کون پکارے گا فراز
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

☆☆

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کہ مرے دل میں پڑی ہو جیسے

☆☆

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

☆☆

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

☆☆

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

☆☆

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

☆☆

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اُچھالا دے دوں
میں نہیں، کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا

☆☆

منتظر کب سے تحیر ہے تری تقریر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

جس کو بھی چاہا اُسے شدت سے چاہا ہے فراز
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

☆☆

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

☆☆

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

☆☆

تم اپنی شمعِ تمنا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

☆☆

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پہ
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

☆☆

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

☆☆

ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فرازؔ
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو

☆☆

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

☆☆

شعر کسی کے ہجر میں کہنا، حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں، دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

☆☆

وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

☆☆

اس قدر مسلسل تھیں شدّتیں جدائی کی
آج پہلی بار اُس سے، میں نے بے وفائی کی

☆☆

دل منافق تھا ترے ہجر میں سویا کیسے
اور جب تجھ سے مِلا، ٹُوٹ کے رویا کیسے

☆☆

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں، آپ سا قاتل نہ رہے

☆☆

مری گردن میں بانہیں ڈال دی ہیں
تم اپنے آپ سے اُکتا گئے کیا؟

☆☆

رونے سے ملال گھٹ گیا ہے
بادل تھا برس کے چھٹ گیا ہے

☆☆

وہی عشق جو تھا، کبھی جنوں، اُسے روزگار بنا دیا
کہیں زخم بیچ کے آ گئے، کہیں شعر کوئی سُنا دیا

☆☆

اب لہو رونے کی خواہش، نہ لہو ہونے کی
دلِ زندہ، ترے مر جانے کا موسم آیا

☆☆

جب ملاقاتِ بے ارادہ تھی
اُس میں آسودگی زیادہ تھی

☆☆

اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کہ مقابلے پہ مرے یار آ گئے

☆☆

اول اول کی دوستی ہے ابھی
اک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

☆☆

شدّتِ تشنگی میں بھی غیرتِ مے کشی رہی
اُس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر سرِ عام رکھ دیا

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

☆☆

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

☆☆

میں برف برف رتوں میں چلا، تو اُس نے کہا
پلٹ کے آنا تو کشتی میں دھوپ بھر لانا

☆☆

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
ترے فراق کے دکھ یاد آنے لگتے ہیں

☆☆

تُو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

☆☆

کل نالۂ قُمری کی صدا تک نہیں آئی
کیا ماتمِ گُل تھا، کہ صبا تک نہیں آئی

☆☆

کسی دشمن کا کوئی تیر نہ مجھ تک پہنچا
دیکھنا، اب کے مرا دوست کماں کھینچتا ہے

☆☆

آج تک اپنی بے کلی کا سبب
خود بھی جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

☆☆

ہم تو سچ مچ کے ہی کردار سمجھ بیٹھے تھے
لوگ آخر کو کہیں صورتِ افسانہ کھلے

☆☆

کچھ اپنے دوست بھی ترکش بدوش پھرتے ہیں
کچھ اپنا دل بھی کشادہ ہے، کیا کیا جائے

☆☆

شکستگی میں بھی پندارِ دل سلامت ہے
کہ اُس کے در پہ تو پہنچے مگر صدا نہیں کی

☆☆

لگتا ہے کہ اب چاہتیں آساں ہیں زیادہ
عشاق ہیں کم چاک گریباں ہیں زیادہ

☆☆

گھر تو کیا گھر کی شباہت بھی نہیں ہے باقی
ایسے ویران ہوئے ہیں در و دیوار کہ بس

☆☆

مجھ کو مٹی کیا تُو نے، تو یہ احسان بھی کر
کہ مری خاک کو اب کوزہ گروں تک پہنچا

☆☆

ہر یاد کو یوں زخم بناتے نہیں دل کا
ہر تیر کو پیوستِ رگِ جاں نہیں کرتے

☆☆

وہ تو پتھر پہ بھی گزرے، نہ خدا ہونے تک
جو سفر میں نے نہ ہونے سے کیا ہونے تک

زندگی اس سے زیادہ تو نہیں عمر تری
بس کسی دوست کے ملنے سے جدا ہونے تک

☆☆

نہ اعتبار، نہ آسودگی، نہ قرب ترا
فقط تکلّفِ دیوار و در ہے گھر کیسا

☆☆

ترے جمال سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے
یہ سیر چشم مگر کب اُدھر کو دیکھتے ہیں

☆☆

گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے
کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن تم جیسے

☆☆

زیست اک آدھ محبت سے بسر ہو کیسے
رات لمبی ہو تو پھر ایک کہانی کم ہے

☆☆

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اُس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ

اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

جو شرف ہم کو ملا کوچۂ جاناں سے فرازؔ
سُوئے مقتل بھی گئے ہیں اُسی پندار کے ساتھ

☆☆

میں تو اُس صبحِ درخشاں کو تونگر جانوں
جو مرے شہر سے کشکولِ گدائی لے لے

☆☆

وہ مروّت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

☆☆

امتحاں دل کا نہیں طبل و علَم کا ہے تو پھر
جا یہ لشکر بھی ترا، تیغ و زرہ بھی تیری

☆☆

پھر قفس میں شور اُٹھا، قیدیوں کا اور صیّاد
دیکھنا اُڑا دے گا، پھر خبر رہائی کی

☆☆

سُنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

☆☆

نو گرفتارِ وفا، سعیِ رہائی ہے عبث
ہم بھی اُلجھے تھے بہت دام سے پہلے پہلے

☆☆

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

☆☆

ساقیا مسجد و مکتب نہیں مے خانہ
دیکھنا پھر بھی غلط لوگ نہ آنے لگ جائیں

☆☆

ہم ایسے سادہ دلوں کو، وہ دوست ہو کہ خدا
سبھی نے وعدۂ فردا پہ ٹال رکھا ہے

☆☆

یا گرمیِ بازار تھی یا خوفِ خزاں تھا
پھر بیچ دیا مجھ کو خریدار نے میرے

☆☆

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گل فروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہو نا خوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فرازؔ
لوگ رہتے ہیں اسی شہرِ دل آزار کے بیچ

☆☆

ہر کوئی دل کی ہتھیلی پہ ہے صحرا رکھے
کسے سیراب کرے وہ، کسے پیاسا رکھے

ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی ہم نام ترا
کوئی تجھ سا ہو تو پھر نام بھی تجھ سا رکھے

☆☆

فرازؔ آج کی دنیا مرے وجود میں ہے
مرے سخن کو فقط میرا تذکرہ نہ سمجھ

☆☆

یوں تو کہنے کو بہت لوگ شناسا میرے
کہاں لے جاؤں تجھے اے دلِ تنہا میرے

☆☆

اب فرازؔ تجھ پر بھی اعتبار کیا کیجیے
انتظار تھا کس کا ساتھ چل پڑا کس کے

☆☆

کیا خبر تھی اے نگارِ شعر تیرے عشق میں
دلبرانِ شہر کے دلدار بن جائیں گے ہم

☆☆

آج اُس نے شرفِ ہم سفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

لوگ کس طرح سے آئینہ صفت جیتے ہیں
میں تو مر جاؤں اگر کوئی مقابل نہ رہے

☆☆

میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا
قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا

میں کہ صحرائے محبت کا مسافر تھا فرازؔ
ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا

☆☆

یہ کیوں ہمیشہ مری طلب ہی تمہیں صدا دے
کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

☆☆

ہم دہری اذیّت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل، شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

☆☆

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

☆☆

اس سے بڑھ کر کوئی انعامِ ہنر کیا ہے فرازؔ
اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ بن جائے

☆☆

سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقیں آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

یہ کیا کہ تم بھی سرِ راہ حال پوچھتے ہو
کبھی ملو ہمیں بازار کے علاوہ بھی

☆☆

اُس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

☆☆

کوئی سخن برائے قوافی نہیں کہا
اک شعر بھی غزل میں اضافی نہیں کہا

☆☆

ہم تو چاہت میں بھی غالبؔ کے مقلد ہیں فرازؔ
جس پہ مرتے ہیں اُسے مار کے رکھ دیتے ہیں

☆☆

ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
روز آ جاتا ہے سمجھاتا ہے یُوں ہے یُوں ہے

شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فرازؔ
یہ بھی اک سلسلۂ کُن فیکوں ہے یوں ہے

☆☆

میں خوش ہوں راندۂ افلاک ہو کر
مرا قد بڑھ گیا ہے خاک ہو کر

☆☆

جب سے فراز تخلص رکھا، ملکوں ملکوں رسوا ہیں
ورنہ ہمیں بھی یاد نہیں ہم احمد شاہ کہلاتے تھے

☆☆☆☆

انتخابِ غزل

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بُجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دُور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیروں میں ہیں دنیا کو دِکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اَب گلشن پہ
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فرازؔ
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

(تنہا تنہا)

کیا رُخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہُوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں ان دِنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فرازؔ آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فرازؔ پنکھڑی تھی

(تنہا تنہا)

منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقریر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا

عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شیر کا

جس کو بھی چاہا اسے شدّت سے چاہا ہے فرازؔ
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

(دردِ آشوب)

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبح دم چھوڑ گیا نکہتِ گُل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آ جاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھُلا ہے اتنا
ہے وہی مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

(دردِ آشوب)

میں کہ پُر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اَب کے ڈوبا ہوں تو سُوکھے ہُوئے دریاؤں میں

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اَب یاد نہیں
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر!
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

(دردآشوب)

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تُو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

اَب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

(دردآشوب)

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمھارا قد و قامت نکل آئے

(جاناں جاناں)

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی تو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تُو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقّع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جُدا ہے غمِ جاناں جاناں

اَب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سربگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بہ پا لگتا ہے
شہر کا شہر ہُوا داخلِ زنداں جاناں

اَب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہُوئے اوراقِ پریشاں جاناں

(جاناں جاناں)

یوں تو پہلے بھی ہُوئے اُس سے کئی بار جُدا
لیکن اَب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دُور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جُدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
''میں جُدا گریہ کناں، ابر جُدا، یار جُدا''

کجکلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوقِ گردن سے نہیں طرّۂ دستار جُدا

اس قدر رُوپ ہیں یاروں کے، کہ خوف آتا ہے
سرِ میخانہ جُدا اور سرِ دربار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فرازؔ
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سرِ دار جُدا

(جاناں جاناں)

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار نہ تھا گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اُس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اُس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اُس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہُوئی ہُوئی نہ ہُوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

(جاناں جاناں)

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے پیچ
ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گل فروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ

قاتل اِس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہو نا خوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فرازؔ
لوگ رہتے ہیں اسی شہرِ دل آزار کے بیچ

(بے آواز گلی کوچوں میں)

یوں تو کہنے کو بہت لوگ شناسا میرے
کہاں لے جاؤں تجھے اے دلِ تنہا میرے

وہی محدود سا حلقہ ہے شناسائی کا
یہی احباب مرے ہیں یہی اعدا میرے

میں تہِ کاسہ و لب تشنہ رہوں گا کب تک
تیرے ہوتے ہوئے اے صاحبِ دریا میرے

مجھ کو اس ابرِ بہاری سے ہے کب کی نسبت
پر مقدر میں وہی پیاس کے صحرا میرے

دیدہ و دل تو ترے ساتھ ہیں اے جانِ فراز
اپنے ہم راہ مگر خواب نہ لے جا میرے

(نابینا شہر میں آئینہ)

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تُو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

تُو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

دل دھڑکتا نہیں ٹپکتا ہے
کل جو خواہش تھی آبلہ ہے مجھے

ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اِک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

کوہکن ہو کہ قیس ہو کہ فرازؔ
سب میں اک شخص ہی ملا ہے مجھے

(پس انداز موسم)

چاک پیراہنِ گُل کو صبا جانتی ہے
مستیِ شوق کہاں بندِ قبا جانتی ہے

ہم تو بد نامِ محبت تھے سو رسوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلقِ خدا جانتی ہے

کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہ گزر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

ہوس انعام سمجھتی ہے کرم کو تیرے
اور محبت ہے کہ احساں کو سزا جانتی ہے

(پسِ انداز موسم)

تُو جو چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کاہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تیرا غم اپنے تعلق کو نباہے تو میں ہوں

دل نے کب شیوۂ دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پہ نہ ہوا میں سرِ راہے تو میں ہوں

جانے کیا رنگ دکھاتی ہے بہاراں اب کے
دل دریدہ و پریشان نگاہے تو میں ہوں

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جائے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں ہوں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فرازؔ
صاحبِ خرقہ و پیوند کلاہے تو میں ہوں

(خوابِ گُل پریشاں ہے)

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے ربط ہے اُس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
سو ہم بھی اُس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے اپنے ہنر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اُسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے دن کو اُسے تتلیاں ستاتی ہیں
سنا ہے رات کو جگنو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے حشر ہیں اُس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اُس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اُس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
سو اُس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے آئنہ تمثال ہے جبیں اُس کی
جو سادہ دل ہیں اُسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے حمائل ہیں اس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چشمِ تصور سے دشتِ امکاں میں
پلنگ زاویے اُس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سرو قد ہے مگر بے گلِ مراد نہیں
کہ اس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو رہروانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اُس کے شبستاں سے متصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں

رُکے تو گردشیں اُس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اُس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اُسے دیکھے
کبھی کبھی در و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اب اُس کے شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فرازؔ آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

(خوابِ گل پریشاں ہے)

اُس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

آمدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں گرم تھی
میں نے بھی اِک چراغ سا دل سرِ شام رکھ دیا

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ مے کشی رہی
اُس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

اُس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اُس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں برسرِ عام رکھ دیا

اَب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

جو بھی ملا اُسی کا دل حلقہ بگوشِ یار تھا
اُس نے تو سارے شہر کو کر کے غلام رکھ دیا

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

(خوابِ گُل پریشاں ہے)

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہُوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

اس کی وہ جانے اُسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فراز اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

(خوابِ گُل پریشاں ہے)

جب تجھے یاد کریں کارِ جہاں کھنچتا ہے
اور پھر عشق وہی کوہِ گراں کھنچتا ہے

کسی دشمن کا کوئی تیر نہ پہنچا مجھ تک
دیکھنا اَب کے مرا دوست کماں کھنچتا ہے

عہدِ فرصت میں کسی یارِ گزشتہ کا خیال
جب بھی آتا ہے تو جیسے رگِ جاں کھنچتا ہے

دل کے ٹکڑوں کو کہاں جوڑ سکا ہے کوئی
پھر بھی آوازۂ آئینہ گراں کھنچتا ہے

انتہا عشق کی کوئی نہ ہوس کی کوئی
دیکھنا یہ ہے کہ حد کون، کہاں ، کھنچتا ہے

کھنچتے جاتے ہیں رسن بستہ غلاموں کی طرح
جس طرح قافلۂ عمرِ رواں کھنچتا ہے

ہم تو رہوارِ زبوں ہیں وہ مقدر کا سوار
خود ہی مہمیز کرے خود ہی عناں کھنچتا ہے

رشتۂ تیغ و گلو اب بھی سلامت ہے فرازؔ
اَب بھی مقتل کی طرف دل سا جواں کھنچتا ہے

(غزل بہانہ کروں)

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ

ہم نے اِک عمر بسر کی ہے غمِ یار کے ساتھ
میرؔ دو دن نہ جئے ہجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم گھر سے نکلتے ہیں تو رکھ دیتے ہیں
طاق پر عزتِ سادات بھی دستار کے ساتھ

اس قدر خوف ہے اَب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اُس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

شہر کا شہر ہی ناصح ہو تو کیا کیجئے گا
ورنہ ہم رند تو بھڑ جاتے ہیں دو چار کے ساتھ

ہم کو اُس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چُن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

جو شرف ہم کو ملا کوچۂ جاناں سے فرازؔ
سوئے مقتل بھی گئے ہیں اُسی پندار کے ساتھ

(غزل بہانہ کروں)

میں مر مٹا تو وہ سمجھا یہ انتہا تھی مری
اسے خبر ہی نہ تھی خاک کیمیا تھی مری

میں چپ ہوا تو وہ سمجھا کہ بات ختم ہوئی
پھر اس کے بعد تو آواز جابجا تھی مری

جو طعنہ زن تھا مری پوششِ دریدہ پر
اسی کے دوش پہ رکھی ہوئی قبا تھی مری

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں یہی سزا تھی مری

شکست دے گیا اپنا غرور ہی اس کو
وگرنہ اس کے مقابل بساط کیا تھی مری

کہیں دماغ کہیں دل کہیں بدن ہی بدن
ہر اک سے دوستی یاری جدا جدا تھی مری

کوئی بھی کوئے محبت سے پھر نہیں گزرا
تو شہرِ عشق میں کیا آخری صدا تھی مری

جو اب گھمنڈ سے سر کو اٹھائے پھرتا ہے
اسی طرح کی تو مخلوق خاکِ پا تھی مری

ہر اک شعر نہ تھا درخورِ قصیدۂ دوست
اور اس سے طبعِ رواں خوب آشنا تھی مری

میں اس کو دیکھتا رہتا تھا حیرتوں سے فراز
یہ زندگی سے تعارف کی ابتدا تھی مری

(غزل بہانہ کروں)

کسی کی یاد میں اتنا نہ رو ہُوا سو ہُوا
کہ دل گنوا کے اَب آنکھیں نہ کھو، ہُوا سو ہُوا

کوئی اُسے نہ سنائے ہمارا حالِ خراب
مبادا اُس کو بھی افسوس ہو ، ہُوا سو ہُوا

جدائیوں کے زمانوں کا پوچھتے کیا ہو
گزر گئی جو گزرنی تھی ،جو ہُوا سو ہُوا

محبتوں میں عجب تو نہیں اُجڑ جانا
سو مجھ کو دیکھ کے حیراں نہ ہو ، ہُوا سو ہُوا

ہزار اور بھی دکھ دل نے پال رکھے ہیں
چلو یہ عشق کا آزار تو ، ہُوا سو ہُوا

وفا میں ہم بھی کہاں ایسے خوش معاملہ تھے
فقط اُسی سے گلہ کیوں کرو ہُوا سو ہُوا

فرازؔ خوش ہو متاعِ ہُنر سلامت ہے
بلا سے عشق کی بازی میں جو ہُوا سو ہُوا

(غزل بہانہ کروں)

اُس کا اپنا ہی کرشمہ ہے فسوں ہے یوں ہے
یوں تو کہنے کو سبھی کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے

جیسے کوئی درِ دل پر ہو ستادہ کب سے
ایک سایہ نہ دروں ہے نہ بروں ہے یوں ہے

تم نے دیکھی ہی نہیں دشتِ وفا کی تصویر
نوکِ ہر خار پہ اِک قطرۂ خوں ہے یوں ہے

تم محبت میں کہاں سود و زیاں لے آئے
عشق کا نام خرد ہے نہ جنوں ہے یوں ہے

اَب تم آئے ہو مری جان تماشا کرنے
اب تو دریا میں تلاطم نہ سکوں ہے یوں ہے

ناصحا تجھ کو خبر کیا کہ محبت کیا ہے
روز آ جاتا ہے سمجھاتا ہے یوں ہے یوں ہے

شاعری تازہ زمانوں کی ہے معمار فرازؔ
یہ بھی اک سلسلۂ کن فیکوں ہے یوں ہے

(اے عشقِ جنوں پیشہ)

اُس نے جب چاہنے والوں سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

یونہی بیکار میں کب تک کوئی بیٹھا رہتا
اس کو فرصت جو نہ تھی ہم نے بھی رخصت چاہی

شکوہ ناقدریِ دنیا کا کریں کیا کہ ہمیں
کچھ زیادہ ہی ملی جتنی محبت چاہی

رات جب جمع تھے دکھ دل میں زمانے بھر کے
آنکھ جھپکا کے غمِ یار نے خلوت چاہی

ہم جو پامالِ زمانہ ہیں تو حیرت کیوں ہے
ہم نے آبا کے حوالے سے فضیلت چاہی

میں تو لے آیا وہی پیرہنِ چاک اپنا
اُس نے جب خلعت و دستار کی قیمت چاہی

حُسن کا اپنا ہی شیوہ تھا تعلق میں فرازؔ
عشق نے اپنے ہی انداز کی چاہت چاہی

(اے عشقِ جنوں پیشہ)

کبھی کہیں مرے غم خوار کے علاوہ بھی
کوئی تو بات کروں یار کے علاوہ بھی

یہ کیا کہ تم بھی سرِ راہ حال پوچھتے ہو
کبھی مِلو ہمیں بازار کے علاوہ بھی

اجاڑ گھر میں یہ خوشبو کہاں سے آئی ہے
کوئی تو ہے در و دیوار کے علاوہ بھی

سو دیکھ کر ترے رخسار و لب یقین آیا
کہ پھول کھلتے ہیں گلزار کے علاوہ بھی

کبھی فراؔز سے آ کر ملو جو وقت ملے
یہ شخص خوب ہے اشعار کے علاوہ بھی

(اے عشقِ جنوں پیشہ)

باغباں ڈال رہا ہے گُل و گلزار پہ خاک
اب بھی میں چپ ہوں تو مجھ پر مرے اشعار پہ خاک

کیسے بے آبلہ پا بادیہ پیما ہیں کہ ہے
قطرۂ خوں کے بجائے سرِ ہر خار پہ خاک

سرِ دربار ستادہ ہیں پئے منصب و جاہ
تُف بر اہلِ سخن و خلعت و دستار پہ خاک

آ کے دیکھو تو سہی شہر مرا کیسا ہے
سبزہ و گُل کی جگہ ہے در و دیوار پہ خاک

تا کسی پر نہ کھُلے اپنے جگر کا احوال
مَل کے آ جاتے ہیں ہم دیدۂ خونبار پہ خاک

بس کہ اک نانِ جویں رزقِ مشقت تھا فرازؔ
آ گیا ڈال کے میں درہم و دینار پہ خاک

(اے عشقِ جنوں پیشہ)

انتخابِ نظم

لختئی ☆

ادھ کٹے بالوں پہ افشاں کے ستارے لرزاں
کھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
سرد و بے جان سے چہرے پہ تھرکتی آنکھیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام امنگ
کسی سوکھی ہوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی گراں رفتاری
خشک ہوتی ہوئی ندی کا بہاؤ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشواز پہ بانہوں کی اُڑان
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
چند لمحوں کے لیے دائرے بن جاتے ہیں

☆ سرحد کے وہ رقاص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ بنا کر ناچتے ہیں۔

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
ریگ زاروں سے عرق پھوٹ رہا ہو جیسے
جھنجھناتے ہوے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
دور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب
منجمد، ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تانبے کے تراشے ہوئے سکوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

(تجا تجا)

فنکاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دنیا کے خوابوں کی جنت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے انسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عمر بھر خوں اُگلتے رہے

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سناتے رہے
جب بھی تخریب کی تند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے
تم نے ہر اک کے دکھ اپنے دل سے لگائے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدّعی
تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کہیں
تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے کوچۂ دار تک
کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

(دردآشوب)

☆☆

سوال
(فراق کی تصویر دیکھ کر)

ایک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور نڈھال زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُجاڑ زندگی کے
لمحات کی اَن گِنت خراشیں
آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
روٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت کہ بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھو لے

یہ زخمِ طلب یہ نامرادی
ہر بُت کے لبوں پہ ہے تبسم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے کہ خالق
انسان جواب چاہتا ہے

(دردآشوب)

پیغام بر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لیے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انباروں کو کاندھوں پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مُو افسردہ رُو خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلم پر سراپا التماس
اس تمنا پر کہ تم کو مل سکے
غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن ---- جینے کی آس
میں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
میں نہیں جوہر شناس
صورتِ انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دل ہیں قہقہوں سے چُور
لیکن آنکھ سے آنسو رواں
سب کے سینوں میں اُمیدوں کے چراغاں

اور چہروں پر شکستوں کا دھواں

زندگی سب سے گریزاں

سُوئے مقتل سب رواں

سب نحیف و ناتواں

سب کے سب اک دوسرے کے ہم سفر

اک دوسرے سے بدگماں

سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس

میری باتوں سے مری آواز سے

تم نے یہ جانا کہ میں بھی

لے کے آیا ہوں تمھارے واسطے وہ معجزے

جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمھارے

اَن گنت صدیوں کے لاتعداد زخم

دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم

منتظر ہیں قم باذنی کی صدائے سحر کے

ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں

اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں۔۔۔۔تیرہ جبیں

من وسلویٰ کے لیے دامن کشا

قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں

صرف تقدیر و توکل پر یقیں

تم کو شیریںِ طلب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سِل کو

چیرنے کا حوصلہ، یارا نہیں

تم ید بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں

تم کہ ہو کوہ گرفتہ۔۔۔۔زندگی سے دُور

مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں
خاک داں کی اس گلِ تاریک کا
میں بھی اک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم
سایۂ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمھارا جزوِ دیں
سات قلزم موجزن چاروں طرف
اور تمھارے بخت میں شبنم نہیں
اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو
تم نے کھولا ہے کبھی؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی؟
سب کی روحیں گرسنہ۔۔۔۔سب کی متاعِ درد میں
دوسروں کا خون پینے کی ہوس
ایک کا دکھ دوسروں سے کم نہیں
ایک کا دُکھ تشنگی، بیچارگی
دوسروں کا دُکھ مگر افراطِ مے۔۔۔۔دیوانگی
پیاس اور نشے کا دکھ
اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشے کا دُکھ اک دوسرے میں بانٹ لو
پھر تمھاری زندگی شاید نہ ہو
شاکیِ عرشِ بریں و رحمت اللعالمیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

(دردآشوب)

کشان بی بی ☆

تو جب
بمبریت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی جسم شل
اعضا تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان ۔۔۔۔ بے حس تھے
کبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
رُوحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں یک جا ہیں
ضیا، باسط، سعید اور میں
ہمارا میزباں کب سے نہ جانے
گھر کے دروازے کھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا
ہم اجنبی مہماں

☆ کافرستان کی ایک لڑکی

سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اس وادی میں آئیں گے
چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک وعود ومُر کی خوشبوؤں
سے بھرپور بوجھل
طائرانِ خوش نما و خوش نوا ۔۔۔۔ بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم ویاقوت سا جھل مل
ادھر کچھ دور بز غالوں کے گلے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف ودل آرا
فضا حیرت فزا ۔۔۔ سحر آفریں دنیا
"مژدہ بہ ہم مزنِ تا نشکنی رنگ تماشا را"

ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر
ہم خرّم و خنداں تھے
کشادہ طشت میں بز غالۂ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ میں دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوب صورت تھی
مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں

زمینی خلد کی حوریں
دف و مر دنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
کبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پا گوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے ۔۔۔ مجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اُٹھیں

کبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
نگروہ سر گروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں

کشان بی بی
قد وقامت قیامت
جنبشیں جادو
بدن طوفاں
ضیا کردار میں گوتم
مجسم صدق وایثار و وفا
درد آشنا و نفس کش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فن کار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشان و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں
یہاں دنیا کے غم بھولا ہُوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر جذبات کا پتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں

جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
میں بُت
کشان بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل
لذتِ معنی سے نامحرم
زبانِ یار کیلاشی و ما از حرفِ بیگانہ
(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشان بی بی یہ کہتی ہے
مرے محبوب تو اک دستۂ مُر ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب

جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گُلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنین
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی چکوری
تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آ مرے ہمراہ چل پیاری

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرہ
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی
ضیا گوتم سہی
لیکن کشاں بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشاں بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج

گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد انداز استغناء و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

(نایافت)

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں
جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں
مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنی!
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

(جاناں جاناں)

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھُکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علَم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نُور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں

(جاناں جاناں)

مت سوچو

اور اس نے
مرے ساغر میں
مئے سرخ انڈیلی۔۔۔تو کہا
مت سوچو
تم یہاں آئے ہو
اس ملک کے
اس شہر کے
اس حجلۂ تسکیں میں جہاں
سب کے سب رقص کناں
نغمہ بلب
مست ادا۔۔۔مت سوچو
جاگتی رات
کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا
مت سوچو!
تم بھی کیا لوگ ہو

پردیس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دل افگار

عزیزانِ وطن کی یادیں

اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبوں کو تو

خودکار مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں

یہ جو زنگار ہیں غربت کے

خود آزاد جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

آلائشیں جسموں کی ہیں

تم انھیں ایسے سنبھالے ہوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمھارے دل و جاں ہوں

اس گھڑی تم ہو جہاں

مملکت خواب نہیں

یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں

زندگی مے کی طرح

شوخ ہے طرّار ہے

زہراب نہیں

اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری

اس جگہ شاملِ آداب نہیں

مت سوچو!

(جاناں جاناں)

اب کس کا جشن مناتے ہو

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کے گیت سناتے ہو
اُس تن من کا جو دونیم ہوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تقدیر ہوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہوا

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اُس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بدقسمت تھا
راہوں میں بہا یا تن میں رہا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کِھلا یا بَن میں رہا

اُس مشرق کا جس کا تم نے
نیزے کی انی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لُوٹا کم سمجھا

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عِفّت
لُٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اس عیسیٰ کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

ان نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے
ایسے جلاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقصِ سرِ بازار کریں
یا ان ظالم قزاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اِس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمہارے حصے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھا ہے اس قصے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لیے
اس جشن میں شامل ہوں میں بھی
نوحوں سے بھرا کشکول لیے

(جاناں جاناں)

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اُس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تُو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہوں
تو بازوسناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں
تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے

شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے جو
ظلم کے موسموں میں
کُھلے آسمانوں تلے
اِس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مَس سے
سکوتِ زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بُو ہے
قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا
وہ بازو

جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر
بے کفن اُن کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرا لیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب اُن کی ثنا چار سُو ہے
قلم سرخرو ہے

(جاناں جاناں)

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!
تری بارگاہِ معلّیٰ میں
عصیاں کے انبار سے سرنگوں
اک گنہگار انساں کھڑا ہے
نہ اس کے بدن پر عبا و قبا ہے
نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے
نہ ماتھے پہ محراب داغ ریا ہے
یہ وہ بدمقدر ہے
جس کا بدن بارشِ سنگِ خلقت سے
غربال ہے
جس کی گردن میں طوقِ ملامت پڑا ہے
یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجرم ہے
ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا
کہ جو تُو نے کاذب جہاں کو عطا کیں

یہ مجرم ہے
ان بے غرض جرأتوں کا
جو تُو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیں

یہ کہتا ہے
اے دائمی حکمتوں کے پیمبر
کہ انسان سارے برابر ہیں

ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے
یہ کہتا ہے
الفاظ سب سے مقدس ہیں
اور حرف کی روشنی سے
کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے
یہ سرکش
مقدر کو انساں کا رہوار کہتا ہے
آدم کو نقاشِ ہستی کا شہکار کہتا ہے
کیا کچھ یہ ظالم گنہگار کہتا ہے
اے روشنی کے پیمبر
یہ شوریدہ سر
حرف زن ہے
کہ محراب و منبر سے
فتویٰ گر و فتنہ پرداز دیں
حرفِ حق بیچتے ہیں
فقیہانِ مسند نشیں
حرصِ دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں
پیمبر!
مجھے حوصلہ دے
کہ میں ظلم کی قوتوں سے
اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں
اکیلا کھڑا ہوں

(جاناں جاناں)

سلام اُس پر

حسین!
اے میرے سر بریدہ
بدن دریدہ
سدا ترا نام برگزیدہ
میں کربلا کے لہو لہو دشت میں تجھے
دشمنوں کے نرغے میں
تیغ در دست دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں
کہ تیرے سارے رفیق
سب ہمنوا
سبھی جانفروش
اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں
گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے چراغ سے
تابناک چہرے بجھا چکے ہیں
مسافرانِ رہِ وفا لٹ چکے ہیں
اور اب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارہ صبح کی طرح

روشنی کا پرچم لیے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے
اک داستاں کا حصہ نہیں ہے
اک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

میں آج اسی کربلا میں
بے آبرو نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسین کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عز وفخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لٹا کر
منارۂ عرش چھو گیا ہے
سلام اس پر
سلام اس پر

(جاناں جاناں)

اے مری عرضِ وطن

اے مری ارضِ وطن، پھر تری دہلیز پہ میں
یوں نگوں سار کھڑا ہوں کوئی مجرم جیسے
آنکھ بے اشک ہے بہہ سے ہوئے بادل کی طرح
ذہن بے رنگ ہے اجڑا ہُوا موسم جیسے
سانس لیتے ہوئے اِس طرح لرز جاتا ہوں
اپنے ہی ظلم سے کانپ اٹھتا ہے ظالم جیسے

تُو نے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تُو نے وہ سحر مرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کوچھپا دیتا ہے
تُو نے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

اور میں مستِ مئے رامش و رنگِ ہستی
اتنا بے حس تھا کہ جیسے کسی قاتل کا ضمیر
یہ قلم تیری امانت تھا مگر کس کو ملا؟
جو لُٹا دیتا ہے نشے میں سلف کی جاگیر
جیسے میزانِ عدالت کسی کج فہم کے پاس
جیسے دیوانے کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیر

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے مرے گھر کا چراغ
تیرے میخانے پہ کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
اور میں خوش تھا سلامت ہے ابھی میرا ایاغ
میں نے اپنے ہی گنہگار بدن کو چوما
گرچہ جویائے محبت تھے ترے جسم کے داغ

حجلۂ ذات میں آئینے جڑے تھے اتنے
کہ میں مجبور تھا گر محوِ خود آرائی تھا
تیری روتی ہوئی مٹی پہ نظر کیا جمتی
کہ میں ہنستے ہوئے جلووں کا تمنائی تھا
ایک پل آنکھ اٹھائی بھی اگر تیری طرف
میں بھی اوروں کی طرح صرف تماشائی تھا

اور اب خواب سے چونکا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
ایک اک حرف مرا تیرِ ملامت ہے مجھے
تُو اگر ہے تو مرا فن بھی مری ذات بھی ہے
ورنہ یہ شامِ طرب صبحِ قیامت ہے مجھے
میری آواز کے دکھ سے مجھے پہچان ذرا
میں تو کہہ بھی نہ سکوں کتنی ندامت ہے مجھے

آج سے میرا ہنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلم ہے پکاروں گا تجھے

(شب خون)

مت قتل کرو آوازوں کو

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اتارے جاتے ہو

ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو

اس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو

ہم پالنہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں

تم کس کا لہو پینے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا

جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا

جب قتل ہوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا

جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کس پہ سنگ اٹھاؤ گے

اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

(بے آواز گلی کوچوں میں)

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں میرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر برج، ہر منارے پہ
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اس کے

وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے

تمام صوفی و سالک، سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

تم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمانِ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اک مصاحبِ دربار کے اشارے پہ
گداگرانِ سخن کے ہجوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تمھارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کہ نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
یہ شرط نامہ جو دیکھا، تو ایلچی سے کہا

اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پہ گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں، یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

(بے آوازگلی کوچوں میں)

نئی مسافت کا عہد نامہ

مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
جو میرے دیوار و در سے ٹپکا
تو شاہراہوں تک آ گیا تھا
جہاں کسی کو گماں نہیں تھا
مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
مرے مقدر میں آبرو
کی تمام لمبی مسافتیں تھیں
مرے سفر میں
حسینؑ کے سر، مسیحؑ کے جسم
کی سبھی دردناکیاں تھیں، اذیتیں تھیں
مگر مرا درد بے وقر تھا
مگر مرا دشت بے شجر تھا
یہ بات برسوں کی ہے...... تو ہو
پر وہ ساعتیں اب بھی نوحہ گر ہیں

جہاں کہیں بھی ہجوم ہوتا
تو سب مری سمت دیکھتے
اور طنز کرتے
کہ اس کو دیکھو
یہ کون پیکر ہے
جس کا چہرہ نہیں
میں اُن سے کہتا
کہ میں تمہی میں سے ہوں
یہ دیکھو
یہ میری مٹی یہ میری دنیا یہ خواب میرے
وہ مجھ سے کہتے
کہ تیری مٹی کو تیری دنیا کو تیرے خوابوں کو کون دیکھے
کہ تیری آنکھیں نہیں
میں ان سے کہتا کہ
میرے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں صداقتوں کی، رفاقتوں کی
وہ مجھ سے کہتے
بدن تو دیوار کا بھی ہوتا ہے
ہاتھ اشجار کے بھی ہوتے ہیں
جس کی شاخوں کی نوک پر
صرف ایک پتا لرزتا رہتا ہے
پر وہ دیوار اور وہ اشجار ہم نہیں ہیں
میں ان سے کہتا
کہ مجھ کو دیکھو

نہ میری گردن میں طوق ہے
اور نہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں
مگر وہ کہتے
بہت سے محکوم بے رسن ہیں
کہ دست و پا کی کشادگی کا عذاب
حیواں بھی جھیلتے ہیں
پر اُن کے ماتھوں کی لوح پر
کوئی نام کندہ
نہ اُن کے چہروں پر
عہد نامہ کوئی رقم ہے
یہ عہد نامہ
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہے ثبات بھی ہے
میں نسلِ آدم کے اس قبیلے کا فرد تھا
پر کوئی مجھے جانتا نہیں تھا
میں اپنے ایثار کے فسانے انہیں سناتا
مگر کوئی مانتا نہیں تھا
ہم ایک جیسے تھے
پر گروہِ الم کشاں میں
کوئی بھی اک دوسرے کو پہچانتا نہیں تھا
کہ سب کے چہرے تھے سب کے ماتھے تھے
اور ماتھوں پہ
عہد نامے لکھے ہوئے تھے

محبتوں کے صداقتوں کے
سفر کی ساری رفاقتوں کے
بیافرا کی پہاڑیوں
ویت نام کے جنگلوں
بلا کی قیامتوں کے
تمام پیکر تمام چہرے تھے
آئینے ان علامتوں کے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہیں، ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں
میں سر بریدہ پلٹ کے آیا
تو ساتھ سارے نشان لایا
اَنا کے
پندار کے
وفا کے
مرا لہو ندیوں کی صورت بہا تو قلزم بنا گیا ہے
مرا لہو پھیل کر
مری خوش نہاد مٹی کی سرحدوں کو بچا گیا ہے
وہ میرے چہرے پہ ایسی آنکھیں لگا گیا ہے
جو دوسروں سے عظیم تر ہیں
جو سب کی نظروں میں معتبر ہیں
وہ زندگی کا ثبوت بھی ہیں ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں

(نیا شہر میں آئینہ)

واپسی

اُس نے کہا
سُن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
اور دریا دریا پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں ڈوبو
جس دل میں بھی اُترو
میری طلب آواز نہ دے گی
لیکن جب میری چاہت
اور میری خواہش کی لَو
اتنی تیز اور اتنی
اونچی ہو جائے
جب دل رو دے
تب لوٹ آنا

(نابینا شہر میں آئینہ)

ہم اپنے خوب کیوں بیچیں

فقیرانہ روش رکھتے تھے
لیکن اس قدر نادار بھی کب تھے
کہ اپنے خواب بیچیں
ہم اپنے زخم آنکھوں میں لئے پھرتے تھے
لیکن روکشِ بازار ہم کب تھے
ہمارے ہاتھ خالی تھے
مگر ایسا نہیں پھر بھی
کہ ہم اپنی دریدہ دامنی
الفاظ کے جگنو
لئے گلیوں میں آوازہ لگاتے
"خواب لے لو خواب"
لوگو
اتنے کم پندار ہم کب تھے
ہم اپنے خواب کیوں بیچیں

کہ جن کو دیکھنے کی آرزو میں
ہم نے آنکھیں تک گنوا دی تھیں
کہ جن کی عاشقی میں
اور ہوا خواہی میں
ہر ترغیب کی شمعیں بجھا دی تھیں
چلو ہم بے نوا
محرومِ سقف و بام و در ٹھہرے
پر اپنے آسماں کی داستانیں
اور زمیں کے انجم و مہتاب کیوں بیچیں
خریدارو!
تم اپنے کاغذی انبار لائے ہو
ہوس کی منڈیوں سے درہم و دینار لائے ہو
تم ایسے دام تو ہر بار لائے ہو
مگر تم پر ہم اپنے حرف کے طاؤس
اپنے خون کے سرخاب کیوں بیچیں
ہمارے خواب بے وقعت سہی
تعبیر سے عاری سہی
پر دل زدوں کے خواب ہی تو ہیں
نہ یہ خواب زلیخا ہیں
کہ اپنی خواہشوں کے یوسفوں پر تہمتیں دھرتے
نہ یہ خواب عزیزِ مصر ہیں
تعبیر جن کی اس کے زندانی بیاں کرتے
نہ یہ اُن آمروں کے خواب

جو بے آسرا خلقِ خدا کو دار پہ لائیں
نہ یہ غارت گروں کے خواب
جو اوروں کے خوابوں کو تہہِ شمشیر کر جائیں
ہمارے خواب تو اہلِ صفا کے خواب ہیں
حرف و نوا کے خواب ہیں
مہجور دروازوں کے خواب
محصور آوازوں کے خواب
اور ہم یہ دولتِ نایاب کیوں بیچیں
ہم اپنے خواب کیوں بیچیں؟

(نابینا شہر میں آئینہ)

شہر نامہ

(اوجڑی کیمپ کے حوالے سے)

وہ عجیب صبحِ بہار تھی
کہ سحر سے نوحہ گری رہی
مری بستیاں تھیں دُھواں دُھواں
مرے گھر میں آگ بھری رہی

میرے راستے تھے لہو لہو
میرا قریہ قریہ فگار تھا
یہ کفِ ہوا یہ زمین تھی
وہ فلک کہ مشتِ غبار تھا

کئی آبشار سے جسم تھے
کہ جو قطرہ قطرہ پگھل گئے
کئی خوش جمال طلسم تھے
جنھیں گرد باد نگل گئے

کوئی خواب نوکِ سناں پہ تھا
کوئی آرزو تہِ سنگ تھی
کوئی پھول آبلہ آبلہ
کوئی شاخ مرقدِ رنگ تھی

کئی لاپتہ میری لُعبتیں
جو کسی طرف کی نہ ہوسکیں
جو نہ آنے والوں کے ساتھ تھیں
جو نہ جانے والوں کو روکیں

کہیں تارِ ساز سے کٹ گئی
کسی مطربہ کی رگِ گلو
مئے آتشیں میں وہ زہر تھا
کہ تڑخ گئے قدح و سبُو

کوئی نَے نواز تھا دم بخود
کہ نفس سے حدّتِ جاں گئی
کوئی سر بہ زانو تھا باربُد
کہ صدائے دوست کہاں گئی

کہیں نغمگی میں وہ بَین تھے
کہ سماعتوں نے سُنے نہیں
کہیں گونجتے تھے وہ مرثیے
کہ انیسؔ نے بھی کہے نہیں

یہ جو سنگ ریزوں کے ڈھیر ہیں
یہاں موتیوں کی دکان تھی
یہ جو سائبان دھوئیں کے ہیں
یہاں بادلوں کی اڑان تھی

جہاں روشنی ہے کھنڈر کھنڈر
یہاں قُمقُموں سے جوان تھے
جہاں چیونٹیاں ہوئیں خیمہ زن
یہاں جگنوؤں کے مکان تھے

کہیں آبگینہ خیال کا
کہ جو کربِ ضبط سے چُور تھا
کہیں آئینہ کسی یاد کا
کہ جو عکسِ یار سے دور تھا

مرے بسملوں کی قناعتیں
جو بڑھائیں ظلم کے حوصلے
مرے آہوؤں کا چکیدہ خوں
جو شکاریوں کو سراغ دے

مری عدل گاہوں کی مصلحت
مرے قاتلوں کی وکیل ہے
مرے خانقاہوں کی منزلت
مری بزدلی کی دلیل ہے

مرے اہلِ حرف و سخن سرا
جو گداگروں میں بدل گئے
مرے ہم صفیر تھے حیلہ جُو
کسی اور سمت نکل گئے

کئی فاختاؤں کی چال میں
مجھے کرگسوں کا چلن لگا
کئی چاند بھی تھے سیاہ رُو
کئی سورجوں کو گہن لگا

کوئی تاجرِ حسب و نسب
کوئی دیں فروشِ قدیم ہے
یہاں کفش بر بھی امام ہیں
یہاں نعت خواں بھی کلیم ہے

کوئی فکر مند کُلاہ کا
کوئی دعویٰ دار قبا کا ہے
وہی اہلِ دل بھی ہیں زیبِ تن
جو لباس اہلِ ریا کا ہے

مرے پاسباں، مرے نقب زن
مرا مُلک مِلکِ یتیم ہے
مرا دیس امیرِ سپاہ کا
مرا شہر مالِ غنیم ہے

جو روش ہے صاحبِ تخت کی
سو مصاحبوں کا طریق ہے
یہاں کوتوال بھی دُزدِ شب
یہاں شیخِ دیں بھی فریق ہے

یہاں سب کے نِرخ جدا جدا
اسے مول لو اسے تول دو
جو طلب کرے کوئی خوں بہا
تو دہن خزانے کا کھول دو

وہ جو سرکشی کا ہو مرتکب
اسے مچھیوں سے زُبوں کرو
جہاں خلقِ شہر ہو مشتعل
اسے گولیوں سے نگوں کرو

مگر ایسے ایسے غنی بھی تھے
اسی قحط زارِ دمشق میں
جنھیں کوئے یار عزیز تھا
جو کھڑے تھے مقتلِ عشق میں

کوئی بانکپن میں تھا کوہکن
تو جنوں میں قیس سا تھا کوئی
جو صراحیاں لیے جسم کی
مئے ناب خوں سے بھری ہوئی

تھے صدا بلب کہ پیو پیو
یہ سبیل اہلِ وفا کی ہے
یہ نشید نوشِ بدن کرو
یہ کشید تاکِ وفا کی ہے

کوئی تشنہ لب ہی نہ تھا یہاں
جو پکارتا کہ اِدھر اِدھر
سبھی مفت بر تھے تماشہ بیں
کوئی بزم میں کوئی بام پر

سبھی بے حسی کے خمار میں
سبھی اپنے حال میں مست تھے
سبھی راہروانِ رہِ عدم
مگر اپنے زعم میں ہست تھے

سو لہو کے جام انڈیل کر
مرے جانفروش چلے گئے
وہ سکوت تھا سرِ مے کدہ
کہ وہ خم بدوش چلے گئے

کوئی مجلسوں میں رسن بہ پا
کوئی مقتلوں میں دریدہ تن
نہ کسی کے ہاتھ میں شاخِ نَے
نہ کسی کے لب پہ گُلِ سخن

اسی عرصۂ شبِ تار میں
یونہی ایک عمر گزر گئی
کبھی روزِ وصل بھی دیکھتے
یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی

یہاں روزِ حشر بپا ہوئے
پہ کوئی بھی روزِ جزا نہیں
یہاں زندگی بھی عذاب ہے
یہاں موت میں بھی شفا نہیں

(پس انداز موسم)

اے میرے وطن کے خوش نواؤ!
(واشنگٹن میں پاکستانی شعراء کی آمد کے موقع پر لکھی گئی)

اک عمر کے بعد تم ملے ہو
اے میرے وطن کے خوش نواؤ
ہر ہجر کا دن تھا حشر کا دن
دوزخ تھے فراق کے الاؤ
روؤں کہ ہنسوں سمجھ نہ آئے
ہاتھوں میں ہیں پھول دل میں گھاؤ

تم آئے تو ساتھ ہی تمہارے
بچھڑے ہوئے یار یاد آئے
اک زخم پہ تم نے ہاتھ رکھا
اور مجھ کو ہزار یاد آئے
وہ سارے رفیق پا بجولاں
سب کشتۂ دار یاد آئے

ہم سب کا ہے ایک ہی قبیلہ
اک دشت کے سارے ہم سفر ہیں
کچھ وہ ہیں جو دوسروں کی خاطر
آشفتہ نصیب و دربدر ہیں
کچھ وہ ہیں جو خلعت و قبا سے
ایوانِ شہی میں معتبر ہیں

سقراط و مسیح کے فسانے
تم بھی تو بہت سنا رہے تھے
منصور و حسینؑ سے عقیدت
تم بھی تو بہت جتا رہے تھے
کہتے تھے صداقتیں اَمر ہیں
اَوروں کو یہی بتا رہے تھے

اور اب جو ہیں جا بجا صلیبیں
تم بانسریاں بجا رہے ہو
اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ
تم مدحِ یزید گا رہے ہو
جب سچ تہہِ تیغ ہو رہا ہے
تم سچ سے نظر چُرا رہے ہو

جی چاہتا ہے کہ تم سے پوچھوں
کیا راز اس اجتناب میں ہے
تم اتنے کٹھور تو نہیں تھے
یہ بے حسی کس حساب میں ہے
تم چپ ہو تو کس طرح سے چپ ہو
جب خلقِ خدا عذاب میں ہے

سوچو تو تمہیں ملا بھی کیا ہے
اِک لقمۂ تر قلم کی قیمت
غیرت کو فروخت کرنے والو
اک کاسۂ زر قلم کی قیمت
پندار کے تاجرو بتاؤ
دربان کا در قلم کی قیمت

ناداں تو نہیں ہو تم کہ سمجھوں
غفلت سے یہ زہر گھولتے ہو
تھامے ہوئے مصلحت کی میزان
ہر شعر کا وزن تولتے ہو
ایسے میں سکوتِ چشم پوشی
ایسا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو

اک عمر سے عقل و صدق کی لاش
غاصب کی صلیب پر جڑی ہے
اس وقت بھی تم غزل سرا ہو
جب ظلم کی ہر گھڑی کڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

ہے سب کو عزیز کوئے جاناں
اس راہ میں سب جتنے مرے ہیں
خود میری بیاضِ شعر میں بھی
بربادیِ دل کے مرثیے ہیں
میں نے بھی کیا ہے ٹوٹ کر عشق
اور ایک نہیں کئی کیے ہیں

لیکن غمِ عاشقی نہیں ہے
ایسا جو سبک سری سکھائے
یہ غم تو وہ خوش مآل غم ہے
جو کوہ سے جوئے شیر لائے
تیشے کا ہنر جنوں کو بخشے
جو قیس کو کوہکن بنائے

اے حیلہ گرانِ شہرِ شیریں
آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں
ہے بے وطنی گواہ میری
ہر چند پھرا ہوں در بدر میں
بیچا نہ غرورِ نَے نوازی
ایسا بھی نہ تھا سبک ہنر میں

تم بھی کبھی ہمنوا تھے میرے
پھر آج تمہیں یہ کیا ہُوا ہے
مٹی کے وقار کو نہ بیچو
یہ عہدِ ستم جہاد کا ہے
دریوزہ گری کے مقبروں سے
زنداں کی فصیل خوشنما ہے

کب ایک ہی رُت رہی ہمیشہ
یہ ظلم کی فصل بھی کٹے گی
جب حرف کہے گا قُم بہ اِذنی
مرتی ہوئی خاک جی اٹھے گی
لیلائے وطن کے پیرہن میں
بارود کی بُو نہیں رہے گی

پھر باندھیں گے ابروؤں کے دوہے
پھر مدحِ رخ و دہن کہیں گے
ٹھہرائیں گے ان لبوں کو مطلع
جاناں کے لیے سخن کہیں گے
افسانۂ یار و قصۂ دل
پھر انجمن انجمن کہیں گے

(پس انداز موسم)

اے مرے سارے لوگو

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی

پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں
پھر مرے شہر میں بارُود کی بُو پھیلی ہے
پھر سے "تُو کون ہے میں کون ہوں" آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میانِ من و تُو پھیلی ہے

مری بستی سے پرے بھی مرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اترا
آشنا ہاتھ ہی اکثر مری جانب لپکے
میرے سینے میں سدا اپنا ہی خنجر اترا

پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا
پھر ہوئیں عام وہی اہلِ ریا کی باتیں
نعرۂ حُبِّ وطن مالِ تجارت کی طرح
جنسِ ارزاں کی طرح دینِ خدا کی باتیں

اس سے پہلے بھی تو ایسی ہی گھڑی آئی تھی
صبحِ وحشت کی طرح شامِ غریباں کی طرح
اس سے پہلے بھی تو پیمانِ وفا ٹوٹے تھے
شیشۂ دل کی طرح آئینۂ جاں کی طرح

پھر کہاں احمریں ہونٹوں پہ دعاؤں کے دیے
پھر کہاں شبنمیں چہروں پہ رفاقت کی ردا
صندلیں پاؤں سے مستانہ روی روٹھ گئی
مرمریں ہاتھوں پہ جل بجھ گیا انگارِ حنا

دل نشیں آنکھوں میں فرقت زدہ کاجل رویا
شاخِ بازو کے لیے زلف کا بادل رویا
مثلِ پیراہنِ گل پھر سے بدن چاک ہوئے
جیسے اپنوں کی کمانوں میں ہوں اغیار کے تیر
اس سے پہلے بھی ہوا چاند محبت کا دو نیم
نوکِ دشنہ سے کھچی تھی مری دھرتی پہ لکیر

آج ایسا نہیں، ایسا نہیں ہونے دینا
اے مرے سوختہ جانو مرے پیارے لوگو
اب کے گر زلزلے آئے تو قیامت ہو گی
میرے دل گیر مرے درد کے مارے لوگو
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو

(پس انداز موسم)

بنگلہ دیش

(ڈھاکہ میوزیم دیکھ کر)

کبھی یہ شہر مرا تھا زمین میری تھی
مرے ہی لوگ تھے میرے ہی دست و بازو تھے
میں جس دیار میں بے یار و بے رفیق پھروں
یہاں کے سارے صنم میرے آشنا رُو تھے

کسے خبر تھی کہ عمروں کی عاشقی کا مآل
دلِ شکستہ و چشمِ پُر آب جیسا تھا
کسے خبر تھی کہ اس دجلۂ محبت میں
ہمارا ساتھ بھی موج و حباب جیسا تھا

خبر نہیں یہ رقابت تھی ناخداؤں کی
کہ یہ سیاستِ درباں کی چال تھی کوئی
دو نیم ٹوٹ کے ایسی ہوئی زمیں جیسے
مری اکائی بھی خواب و خیال تھی کوئی

یہ میوزیم تو ہے اس روزِ بد کا آئینہ
جو نفرتوں کی تہوں کا حساب رکھتا ہے
کہیں لگا ہوا انبارِ استخواں تو کہیں
لہو میں ڈوبا ہوا آفتاب رکھتا ہے

کہیں مرے سپہ سالار کی جھکی گردن
عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سماں
مرے خدا مری بینائی چھین لے مجھ سے
میں کیسے دیکھ رہا ہوں ہزیمتِ یاراں

میں سر جھکائے ہوئے درد کو چھپائے ہوئے
پلٹ کر آیا تو ہر رہگزر اندھیری تھی
میں سوچتا ہوں ابھی تو چراغ روشن تھے
کبھی یہ شہرا مرا تھا زمین میری تھی

(خوابِ گل پریشاں ہے)

☆☆☆☆

منظوم خراجِ عقیدت

نہیں فرازؔ تو لوگوں کو یاد آتا ہے
وہ نغمہ سنج، وہ خوش گفتگو، وہ خواب فروش

گلزار (انڈیا)

ہم وطن

(احمد فراز کے لیے)

بہت دنوں میں سہی رنگ، دھوپ کا بدلا
بہت دنوں میں سہی، پھر سے مسکرائے تم

پچاس سال سے مَیں ہچکیاں دبائے ہوئے
اس انتظار میں تھا، آنکھ اُٹھا کے دیکھو تم
تو خشک اشکوں کی تحریر پڑھ سکو شاید
کہ میرا درد جدائی کا تم سے کم تو نہ تھا

ہر ایک روز تمہاری زمیں کو سجدہ کیا
ہر ایک رات تمہارے ملک کو چوما ہے
کہ میرے چاند ستارے تو آج بھی ہیں وہی

جو چھت پہ لیٹے ہوئے روز دیکھتے ہو تم
کہ چاند آج بھی پڑھتا ہوں مَیں اُسی رخ سے
وہ جس پہ تم نے کئی بار دستخط کر کے
فلک پہ چھوڑ دیا، رات رات اُڑتا رہے

ہوا گئی جو کبھی جھول کر تمہاری طرف
ہزار گجرے کلائی پہ باندھ کر بھیجا

گئے جو ابر کبھی اُس طرف، کہا اُن سے
وہ لہجہ نرم رکھیں اور ادب سے برسا کریں

ہزار رنجشوں میں بھی، یہی دعائیں کیں
بھرا رہے تیرا آنگن کہ سو چراغ جلیں

تمہیں عزیز ہے اپنا وطن، مَیں جانتا ہوں
مجھے بھی اُس سے محبت ہے، تم یقیں کر لو
ذرا سا فرق ہے گر تم سمجھ سکو اس کو
کہ تم وہیں کے ہو اور مَیں وہیں سے ہوں!!

☆☆☆☆

کشور ناہید

ایک نظم اپنے دوست فراز کے لیے

تجھے اپنی مٹی سے محبت تھی
مگر مٹی بن جانا، تیرا خواب نہیں تھا
تو خود قامت خواب تھا
تو اپنے وطن کے لیے خواب بُنتا تھا
تو چاہتا تھا کہ جس ملک کو
زنجیریں پہنا کر آزاد کیا جا رہا ہے
اس ملک کے بے امان لوگوں کے
لہجے میں وہ تڑپ ہو
کہ پہاڑ لرز اُٹھیں
وہ شعور ہو کہ چنگیزیت
مدفون ہو جائے
وہ طنازی ہو کہ فرعونیت
مجوب ہو جائے
وہ جاذبیت ہو
کہ کھلکھلا کر ہنستی لڑکیاں
تیرے نام اپنی محبت رقم کر رہی ہوں
تُو نے بجھتے چراغوں کو سکھایا تھا
کہ ہوا کا مقابلہ کیسے کیا جاتا ہے

تُو نے حسن و خوبی کے سارے استعارے
ان لیلاؤں کے نام کیے تھے
جو جاگتی تھیں ۔۔۔ تو تیرے شعر پڑھتی تھیں
اور سوتی تھیں ۔۔۔ تو سرہانے
تیرے خواب سنبھال کر رکھتی تھیں
تو محتسبوں اور غاصبوں کو
یاد دلاتا رہتا تھا
کہ غیرت اور حمیت کے جوش میں
یہ بے بس عوام جاگ بھی سکتے ہیں
تُو نے آمروں اور نا عاقبت اندیشوں کو
پشیمان کرنے کے لیے
شاخوں کو کمان بنا سکھایا تھا
تو نے ناصحوں اور ملاؤں کو
قزاقوں کا نامہ بر کہا تھا
اور بھول کے بھی تُو نے
مدح قاتل نہیں لکھی تھی
میں تیرا ماتم نہیں کروں گی
میں تیرے نام کا قصیدہ لکھوں گی
تُو ہمارے قبیلے میں نعرۂ مستانہ
لگانے والا، وہ عزیز دوست تھا
جس نے محمود درویش کی طرح
محبت اور انقلاب کو ۔۔۔ ایک ہی تعویذ میں پرو کر
پنجۂ عدو کو مروڑ ڈالا تھا

بس مجھے تجھ سے ایک گلہ ہے
ساری عمر کی دوستی کو یوں
بے خبری کے حوالے کرتے ہوئے
تجھے کوئی بھی یارِ غار یاد نہیں آیا
کسی رخِ ناز سے راز و نیاز نہیں کیا
یہ تو تیری زندگی کا چلن نہیں تھا
تُو تو خسروئے مے کشاں تھا
بقول فیض ''خم و ساغر اداس ہیں''
تُو تو اس طرح مے خانہ چھوڑنے والا تھا
تجھے تو کبھی موت کی تلاش نہیں تھی
تو پھر یہ سفر ۔۔۔کس لیے اور کیوں

☆☆☆☆

محسن احسان

فراز کی یاد میں

آواز نہ دو زمانے والو
لفظوں کا مسیحا سو گیا ہے
کیوں اپنے غموں پہ رو رہے ہو
وہ سب کے دکھوں پہ رو گیا ہے
تھی کشتِ سخن بحال اس سے
وہ تازہ خیال بو گیا ہے

تھی اس سے بہت پرانی یاری
میں کیسے وہ دن بھلا سکوں گا
یاد آتی ہیں خوش گوار شامیں
یہ زخم کسے دکھا سکوں گا
اشکوں سے بھری ہوئی ہیں آنکھیں
کِس کِس سے یہ دکھ چھپا سکوں گا

مٹی کا نہ کوئی قرض رکھا
سب بارِ وفا چکا دیا ہے
کوندے کی لپک مزاج میں تھی
افلاکِ سخن سجا دیا ہے

جو کچھ بھی تھا ذہن و دل میں اس کے
سب حرفِ ہنر بنا دیا ہے

وہ چین سے ہے لحد میں اپنی
سب اس کے لیے ملال میں ہیں
تابندگیِ ہنر تھی اس میں
اب شعر و سخن زوال میں ہیں
جو حرفِ جنوں لکھے ہیں اس نے
وہ کس کی حدِ کمال میں ہیں

تیرے ہی دم سے زندہ تھی اُمید کی کرن
تو بھی شبِ ملال میں منہ موڑ کر گیا
پہلے ہی دل پہ یاروں کے صدمات کم نہ تھے
احمد فراز تُو بھی ہمیں چھوڑ کر گیا

☆☆☆☆

شبنم شکیل

سدا سہاگن

(فراز کی رومانوی غزل کے نام)

جیسے ملہار چھیڑ دے کوئی
جیسے برسے بہار کا بادل
جیسے بارش میں بھیگتا ہو چاند
جھیل میں جیسے کھل رہا ہو کنول
جیسے رانجھے کی بانسری سن کر
ہیر کے پاؤں کی بجے پائل
اک مدھر راگنی محبت کی
"جس میں لگتی ہوں سب سُریں کومل"
جیسے داسی ہو کالیداس کی اک
"سانوری نار مدھ بھری چنچل"
مالا جپتے ہیں نام کی اس کے
عشق نے جن کو کر دیا پاگل
روپ اس کا کبھی ہے اگنی سا
کبھی شبنم کے جیسا نرمل جل
خود بخود دیپ جل اٹھیں جیسے
روشنی شاعری میں جائے ڈھل
دل میں سب کے مچا دے اک ہلچل
ایسا لہجہ کہ جائے مل مل
بیت جیسے امیر خسرو کی
میر کی جیسے کوئی تازہ غزل

سلطان سکون

نذرِ فراز

کھینچا ہے نقش گر نے اک نقش کیا بھلا سا
احمد فراز نامی اک شخص دل ربا سا

آنکھیں خمار آگیں چہرہ کھلا کھلا سا
آواز میں تپک سی لہجہ ہے رس بھرا سا

شہزادۂ سخن ہے جانِ ہر انجمن ہے
بزمِ سخن وراں میں سب سے لگے جدا سا

سو معجزے سخن کے اُس کو عطا ہوئے ہیں
ہر اک سخن شناسا اُس کے سُخن کا پیاسا

جس بزم میں ہو بیٹھا لگتی ہے کیا بھلی سی
جب وہ غزل سنائے ہونے لگے نشہ سا

باتیں کرے تو گویا جھڑتے ہیں پھول منہ سے
بیٹھا ہو چپ اگر وہ لگتا ہے دیوتا سا

ہر شعر اُس کا دل میں ہو جائے ہے ترازو
سونا غزل ہے اُس کی سونا بھی خاص پاسا

کب سے بنا ہوا ہے لاکھوں دلوں کی دھڑکن
ہر ایک خوش ادا کا لگتا ہے آشنا سا

گو اور بھی سخن ور ہیں باکمال لیکن
احمد فراز ہے بس احمد فراز کا سا

جب تک کہ میں نہ پڑھ لوں تازہ کلام اس کا
ذوقِ سخن میں اپنے محسوس ہو خلا سا
چاہوں کوئی نہ چاہے اُس کو مرے علاوہ
چاہے جو اور کوئی مجھ کو لگے بُرا سا
صورت پہ اُس کی مجھ کو اپنا گمان ہووے
دیکھوں میں جب بھی اُس کو مجھ کو لگے مجھ آسا
تجھ کو کہیں ملے تو کہنا صبا یہ اُس سے
چاہے تجھے نہایت اک شخص بے ریا سا
اُس کو سنانا میرا نذرانۂ محبت
شاید کہ مجھ کو دے دے کچھ داد کا دلاسا
رکھنا خدائے برتر محفوظ ہر بلا سے
وہ کشورِ سخن کا ہے قیمتی اثاثہ
جانی سکون اُس کی میں کیا کروں ستائش
وہ چاند ہے سخن کا اور میں ہوں اک دیا سا

☆☆☆☆

حلیم قریشی

فراز کارنر☆

(Faraz Corner)

ایک کونے میں
سلیقے سے کھڑی خوشبو
ہاتھ باندھے ہوئے
آداب بجالاتے ہوئے
میز پر پھول جو رکھے تھے
اُسے پوچھتے تھے
وہ کُجا ہے؟
جو بہاروں کا امیں ٹھہرا تھا
جس جگہ ہاتھ وہ رکھتا تھا
وہاں روشنی تھی
روشنی جس میں
قلم تان کے وہ لکھتا تھا
جس جگہ پاؤں وہ دھرتا تھا
وہاں کی مٹی
اپنی توقیر پہ نازاں تھی
مگر روتی تھی

☆ اسلام آباد ہوٹل کا وہ حصہ جہاں روزانہ شام کو احمد فراز بیٹھا کرتے تھے۔

اُس کے قدموں کی

مدھُر چاپ کے چپ ہونے پر

دھیان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

میں بھی رویا

مجھ کو اس حال میں دیکھا

تو بڑی چاہت سے

اُس کی تصویر کے رنگوں نے

مجھے تھام لیا

ایک آواز نے

ہولے سے مجھے

ڈھارس دی

اپنے انداز میں

دھیرے سے مرا نام لیا

جیسا اک بات

ادھوری سی

اُسے پوچھنی تھی

جس جگہ ہاتھ وہ رکھتا تھا

وہ روشنی تھی

☆☆☆☆

ادل سومرو

ہر شام، جام لے کر نہیں آتی

احمد فراز کو معلوم تھا
شاعر صرف شاعری میں ہی
زندہ رہ سکتا ہے
احمد فراز کو احساس تھا کہ
اپنے دیس میں
شاعروں کے خواب
اکثر خودکشی کر لیتے ہیں
احمد فراز سمجھتا تھا کہ
ہر معاملے میں چالاکی ہو سکتی ہے
لیکن دوستی اور شاعری میں
چالاکی اچھی نہیں لگتی
احمد فراز کو اعتماد تھا کہ
اس کی شاعری
عاشقی کا علَم بلند کرتے ہوئے
سماجی انقلاب لانے کی
شکتی رکھتی ہے
احمد فراز کا عقیدہ تھا کہ
قاتلوں سے صلح کر کے

اپنے قلم کا سودا کرنا
ضمیر بیچنے کے مترادف ہے
احمد فراز کو ادراک تھا کہ
اپنے فن کی حرمت
اور فکر کی آزادی کے لیے
جلاوطنی
مصلحت پسندی سے بہتر ہے
احمد فراز کو پتا تھا کہ
بحیثیت شخص وہ کسی کو
پسند نہ بھی ہو
مگر اُس کی شاعری
امن، پیار اور انسان دوستی کا
پیغام دیتی ہے
اور لوگوں کے دلوں کے دروازوں پر
دستک دے سکتی ہے
احمد فراز جانتا تھا کہ
بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اُسے بھی بُجھ جانا ہے
لیکن اس کے اشعار
تاریک دلوں کو
روشن کرتے رہیں گے
احمد فراز کو علم تھا کہ
ہر شام، جام لے کر نہیں آتی

ہسپتال کے بستر پر آئی ہوئی شام
کتنی اُداس ہوتی ہے
زندگی ٹھہر جاتی ہے
احمد فراز کو یقین تھا کہ
اُس کی موت پر
کئی آنکھیں نم ہوں گی
اور لوگ ایک دوسرے سے
تعزیت کریں گے!

☆☆☆☆

حسن عباس رضا

نذرِ فراز

شہر میں کوئی اس جیسا شیریں بیاں، اب نہیں ہوئے گا
شامِ یاراں تو ہوگی، مگر وہ سماں، اب نہیں ہوئے گا

آ ہی جاتے تھے یادوں کی پُر پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے
جس گلی بھی چلے جائیں، اس کا مکاں اب نہیں ہوئے گا

میزبانی پہ مامور شہرِ تمنا تو ہوگا، مگر
وہ جو ہوتا تھا اکثر یہاں میہماں، اب نہیں ہوئے گا

جس ملاقات کی آرزو دل میں لے کر یہاں آئے ہو
اس ملاقات کا خواب پورا میاں اب نہیں ہوئے گا

اس کے ہوتے ہوئے کتنی رعنائی آئینہ خانوں میں تھی
ہوں گے آئینے، لیکن وہ منظر یہاں اب نہیں ہوئے گا

معتبر کر دیا جس کے رنگِ سخن نے غزل کا جہاں
وہ کسی بزم میں بھی حسنؔ، نغمہ خواں اب نہیں ہوئے گا

☆☆☆☆

ڈاکٹر صبیحہ صبا

ذرا جلدی نہیں کر دی!

فراز!
اللہ تجھ کو اپنی رحمت میں سدا رکھے
چلو جانا تو سب کو ہے مگر پھر بھی یہ لگتا ہے ذرا جلدی نہیں کر دی
بہت سے کام کرنے تھے
ابھی تو شوق کے آہوئے وحشت کو تجھے زنجیر کرنا تھا
زباں کو تیر کرنا تھا
سنہرے خواب کو تعبیر کرنا تھا
تجھے اے بھولنے والے
ابھی تو اپنی "ضدی نظم" سے عفریتِ استبداد کو "محصور" کرنا تھا
شبِ تاریک کو پُر نور کرنا تھا
ابھی سہمے ہوئے لوگوں کے دل سے خوف، آنکھوں سے اندھیرا دور کرنا تھا
بہت سے کام باقی تھے
ابھی تو ذہن کے آنگن میں غزلوں کی نئی رنگین پریاں ناچتی گاتی اترنا تھیں
تجھے فرصت نہ تھی، ان سے مگر باتیں تو کرنا تھیں
مگر تو کم سخن اپنی ہی مرضی کا
ابھی تو گیسوئے اردو کو سلجھانا بھی باقی تھا
ابھی تو کاکلِ پیچانِ فن میں شانۂ معنی کو الجھانا بھی باقی تھا
ابھی تو اک نئی فرہنگ لکھنا تھی

ابھی تو داستانِ نغمہ و آہنگ لکھنا تھی
گلوں کے مشورے سے شرطِ کسبِ رنگ لکھنا تھی
صبا کے سنگ لکھنا تھی
مگر تُو حیلہ گر اپنی ہی مرضی کا
ابھی تو دوستو کچھ ہنسنا ہنسانا تھا
انہیں سننا سنانا تھا
ابھی تو حسبِ وعدہ حافظ و سعدی پہ کوئی بات ہونا تھی
زبانِ پہلوی کے کچھ نئے پہلو دکھانا تھے
متاعِ غالب و بیدل سے کچھ بٹنا بٹانا تھا
بہت سے کام باقی تھے
ابھی تو سیکھنے والے تری محفل کے متوالے، گھروں سے آنے والے تھے
ابھی تو دور اُفتادہ جزیروں پر، تری آمد کا پھر سے جشن ہونا تھا
کسی کو نیند آنا تھی، نہ اتنی دیر سے جاگے ہوئے لوگوں کو سونا تھا
ابھی تو سال خوردہ، نوجواں، بچے
دیارِ غیر میں رہ کر وطن کو یاد کرنا چاہتے تھے
تری نظمیں، تری غزلیں براہِ راست بس تجھ سے ہی سننا چاہتے تھے
نگاہ و دل میں تجھ کو بے وفا،
آباد کرنا چاہتے تھے
ذرا سی دیر آنکھوں کو مزین
ذہن و دل کو شاد کرنا چاہتے تھے
مگر تُو بادشہ اپنی ہی مرضی کا!
اِدھر آیا کوئی پیغامِ رنگیں
اور تو محفل سے اُٹھ کر دوسری جانب چلا

آتا تو کچھ سرگوشیاں ہوتیں
نئی کچھ جنتی بنتی
مگر تجھ کو تو پہلی ممکنہ پرواز سے جانا ہی ہوتا تھا
ستم ڈھانا ہی ہوتا تھا
نئے قریے، نئے کوچے، نئے احباب
تیری دید کے مشتاق جو ٹھہرے
ترے عشاق جو ٹھہرے
بہانہ جو کہیں کا!

تجھے اے زُود گر
یونہی سحر کو شام کرنا تھا
ذرا آرام کرنا تھا
تجھے جلدی بہت تھی میکدے سے اُٹھ کے جانے کی
تو ٹھہرا بادہ کش اپنی ہی مرضی کا
تجھے خالی یونہی اس زندگی کا جام کرنا تھا
مگر پھر بھی یہ لگتا ہے
ذرا جلدی نہیں کر دی!

☆☆☆☆

ثمینہ راجا

چمن آراستہ ہے

صورتِ صبحِ بہاراں چمن آراستہ ہے
چہرہ شاداب ہے اور پیرہن آراستہ ہے
شہر آباد ہے اک زمزمۂ ہجر سے اور
گھر تری یاد سے اے جانِ من آراستہ ہے
جیسے تیار ہے آگے کوئی ہنگامۂ زیست
اس طرح راہ میں باغِ عدن آراستہ ہے
کوئی پیغام شبِ وصل ہوا کیا لائی
روح سرشار ہوئی ہے، بدن آراستہ ہے
اے غمِ دوست! تری آمدِ خوش رنگ کی خیر
تیرے ہی دم سے یہ بزمِ سخن آراستہ ہے
دل کے اک گوشۂ خاموش میں تصویر تری
پاس اک شاخِ گُلِ یاسمن آراستہ ہے
رامش و رنگ سے چھلکے ہے مرا خواب ایسے
نیند میں جیسے کوئی انجمن آراستہ ہے
اُس نے سورج کی طرح ایک نظر ڈالی تھی
رشتۂ نور سے اب بھی کرن آراستہ ہے
کیا کسی اور ستارے پہ قدم میں نے رکھا
کیسی پیراستہ دنیا، زمن آراستہ ہے
کیسے آئے گا زمانہ مجھے ملنے کے لیے
میرے رستے میں تو دنیائے فن آراستہ ہے

طارق نعیم

وہ کوئی اور تھا

وہ کوئی اور تھا
خاک میں جا کے تم جس کو رکھ آئے ہو
وہ کوئی اور تھا
جس کے ہمراہ میں چل رہا تھا ابھی
وہ تو اب بھی مرے ساتھ ہے
اُس کے سانسوں کی آواز سنتا ہوں میں
اُس کے لہجے کی حدت سے آباد ہے میرا دل
اُس کی باتوں کی خوشبو سے مہکا ہوا ہے یہ گھر
اُس کے حرفوں کی سچائی سے اب بھی روشن ہیں دیوار و در
وہ کوئی اور تھا
خاک میں جس کو تم جا کے رکھ آئے ہو
دل نہیں مانتا
اُس کو جاتے ہوئے میں نے دیکھا نہیں
جس کو جاتے ہوئے ہم نے دیکھا نہ ہو
اُس کے جانے پہ پھر
دل کو سمجھاؤ بھی تو نہیں مانتا
وہ کوئی اور تھا
خاک میں جس کو تم جا کے رکھ آئے ہو

☆☆☆☆

اس خرابے میں کوئی اور بھی ہے

دشت، عشاق سے خالی ہوا جاتا ہے
قلبِ صحرا سے اک آوازسی آتی تھی کبھی
اب نہ رہی
کون ہے جس کو سنیں
اور سکوں ہو کہ ابھی
اس خرابے میں کوئی اور بھی ہے
آبلوں کے وہ ہنر کار
گل ایجاد گئے
ایک اک کر کے چلے جاتے ہیں سب لالہ خرام
اہلِ دل!
اہلِ جگر!
لذتِ درد گئی
لطفِ دل آزار گیا
آؤ! کچھ دیر کو گریہ کر لیں
دشت، عشاق سے خالی ہوا جاتا ہے

☆☆☆☆

محبوب ظفر

نذرِ فراز

ہر ایک دل میں دھڑکتا ہے تیرا نام فراز
ہر ایک لب پہ مہکتی ہے شاعری تیری
ترے حریف بھی کرتے ہیں اعتراف ترا
ترے عدو کو بھی تسلیم برتری تیری
ہیں روز و شب ترے شفاف آئینے کی طرح
کھلی کتاب کے مانند زندگی تیری
نہیں مبالغہ یہ مستند حقیقت ہے
جہاں میں گونج رہی ہے سخن وری تیری
ہزار سازشیں کرتا رہے زمانہ مگر
کچھ اور پھیلتی جائے گی روشنی تیری

کسی بھی موسمِ سفاک میں کسی رُت میں
نہ سرنگوں کیا پندار کا عَلَم تُو نے
ہزار جبر و رعونت کے مرحلوں میں بھی
جبینِ حرف کو ہونے دیا نہ خم تُو نے
ہر ایک عہد سے تُو سُرخرو گزرتا رہا
فروخت کی نہ کبھی حرمتِ قلم تُو نے
انا کی ضربتِ کاری سے توڑ ڈالے ہیں
منافقانہ رویوں کے سب صنم تُو نے

رعونتوں کی سیہ رات میں اے جانِ سخن
سجا دیے ہیں ستارے قدم قدم تُو نے

تصورات کے پیکر تراشنے والے
جمال بھی ترے شعروں میں ہے جلال بھی ہے
ترے سخن میں زمانوں کے دل دھڑکتے ہیں
تری گرفت میں فردا بھی اور حال بھی ہے
دل و نگاہ کے سب موسموں سے واقف تُو
غمِ فراق بھی ہے لذتِ وصال بھی ہے
ترے کلام میں پنہاں ہیں لذتیں کیا کیا
لکھی ہیں تُو نے دلوں کی حکایتیں کیا کیا

☆☆☆☆

کتابیات

گلزار جاوید	براہ راست
تاج سعید۔ زیتون بانو	احمد فراز۔ فن اور شخصیت
منصور آفاق	ان کوٹ
احمد فراز	نایافت
احمد فراز	جاناں جاناں
احمد فراز	دردآشوب
احمد فراز	نابینا شہر میں آئینہ
احمد فراز	بودلک
احمد فراز	شہر سخن آراستہ ہے
احمد فراز	بے آواز گلی کوچوں میں
احمد فراز	پس آواز موسم
حسن رضوی	انداز گفتگو
طارق نعیم	عکاس، اسلام آباد
کتاب	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
ادبیات	اکادمی ادبیات پاکستان
ماہِ نو	پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ

☆☆☆☆

پاکستانی ادب کے معمار سلسلے کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتب	مصنف	سال اشاعت	قیمت مجلد	قیمت غیر مجلد	ریمارکس
1	مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	1991	120/روپے	-	
2	ساغر صدیقی شخصیت اور فن	یونس ادیب	1996	-	120/روپے	ختم
3	شاہ حسین شخصیت اور فن	ڈاکٹر راشد متین/منور نقوی	1998	95/روپے	-	ختم
4	قتیل شفائی شخصیت اور فن	ایڈیٹر/ڈاکٹر راشد متین	1998	95/روپے	-	ختم
5	اشفاق احمد شخصیت اور فن	ایڈیٹر/محمد حمید شاہد	1998	95/روپے	-	ختم
6	ابن انشا شخصیت اور فن	ایڈیٹر/امجد طفیل	1998	95/روپے	-	ختم
7	ظہیر کاشمیری شخصیت اور فن	ایڈیٹر/ڈاکٹر راشد متین	1998	95/روپے	-	ختم
8	سرسید احمد خان شخصیت اور فن	جمیل یوسف	1998	220/روپے	210/روپے	ختم
	اشاعت دوئم	ایضاً	2008	220/روپے	210/روپے	ختم
9	رشید اختر ندوی شخصیت اور فن	زاہد منیر/ڈاکٹر راشد متین	1999	95/روپے	-	ختم
10	حکیم محمد سعید شخصیت اور فن	صادق حسین طارق	1999	-	40 روپے	
11	امتیاز علی تاج شخصیت اور فن	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	1999	-	40 روپے	
12	حفیظ جالندھری شخصیت اور فن	عزیز ملک	2000	-	40 روپے	
13	باقی صدیقی شخصیت اور فن	پروفیسر نجمی صدیقی	2000	-	40 روپے	
13a	شاہ مراد خانپوری حیات و فن	ڈاکٹر شاہد زاہدی	2004	130/روپے	110/روپے	
13b	سلطان باہو حیات و فن	شفیع عقیل	2004	110/روپے	90 روپے	ختم
13c	خوشحال خان خٹک حیات و فن	خدیجہ فیروزالدین/ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک	2005	270/روپے	350/روپے	ختم
14	ڈاکٹر وزیر آغا شخصیت اور فن	رفیق سندیلوی	2006	130/روپے	125/روپے	ختم
15	میرا جی شخصیت اور فن	ڈاکٹر رشید امجد	2006	140/روپے	135/روپے	ختم
16	پطرس بخاری شخصیت اور فن	عبدالحمید اعظمی	2006	145/روپے	140/روپے	ختم
17	محمد خالد اختر شخصیت اور فن	اشفاق احمد ورک	2006	150/روپے	145/روپے	
18	ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	2006	115/روپے	110/روپے	ختم
19	شریف کنجاہی شخصیت اور فن	زاہد حسن	2006	140/روپے	130/روپے	ختم
20	میر گل خان نصیر شخصیت اور فن	واحد بخش بزدار	2006	150/روپے	140/روپے	
21	فیض احمد فیض شخصیت اور فن	اشفاق حسین	2006	210/روپے	200/روپے	ختم
	اشاعت دوئم	ایضاً	2008	210/روپے	200/روپے	ختم
22	شیخ ایاز شخصیت اور فن	ڈاکٹر فگار ہکرو	2006	140/روپے	135/روپے	ختم
23	ابوالفضل صدیقی شخصیت اور فن	نذر الحسن صدیقی	2006	100/روپے	90/روپے	

24	یوسف ظفر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر تصدق حسین راجہ	2006	140/روپے	135/روپے	
25	کاکاجی صنوبر: شخصیت اور فن	حنیف خلیل	2006	145/روپے	130/روپے	ختم
26	مرزا قلیچ بیگ: شخصیت اور فن	نصیر مرزا	2006	115/روپے	110/روپے	
27	سوبھوگیان چندانی: شخصیت اور فن	سید مظہر جمیل	2006	200/روپے	190/روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2010	200/روپے	190/روپے	
28	انتظار حسین: شخصیت اور فن	ڈاکٹر آصف فرخی	2006	145/روپے	130/روپے	ختم
29	منیر نیازی: شخصیت اور فن	امجد طفیل	2006	115/روپے	110/روپے	ختم
30	جمال ابڑو: شخصیت اور فن	منظور علی ویسریو	2006	120/روپے	110/روپے	
31	عبداللہ جان جمالدینی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہ محمد مری	2006	110/روپے	100/روپے	
32	شوکت صدیقی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انوار احمد	2006	100/روپے	90 روپے	
33	سید ہاشمی: شخصیت اور فن	پروفیسر صبا دشتیاری	2006	100/روپے	90 روپے	
34	شاہد احمد دہلوی: شخصیت اور فن	تاج بیگم فرخی	2006	180/روپے	175/روپے	
35	ادا جعفری: شخصیت اور فن	شاہدہ حسن	2007	120/روپے	115/روپے	ختم
36	اجمل خٹک: شخصیت اور فن	عبداللہ جان عابد	2007	200/روپے	190/روپے	ختم
37	سید وارث شاہ: شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	2007	130/روپے	120/روپے	ختم
38	احمد راہی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناہید شاہد	2007	160/روپے	150/روپے	ختم
39	پروین شاکر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلطانہ بخش	2007	145/روپے	135/روپے	ختم
40	محمد حسن عسکری: شخصیت اور فن	عزیز ابن الحسن	2007	155/روپے	140/روپے	
41	جانباز جتوئی: شخصیت اور فن	حمید الفت ملغانی	2007	175/روپے	165/روپے	ختم
42	ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن	عبدالعزیز ساحر	2007	160/روپے	150/روپے	ختم
43	رحمان بابا: شخصیت اور فن	ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی	2007	185/روپے	175/روپے	
44	عطا شاد: شخصیت اور فن	افضل مراد	2007	165/روپے	155/روپے	
45	قلندر مومند: شخصیت اور فن	پروفیسر محمد زبیر حسرت	2007	175/روپے	165/روپے	
46	امیر حمزہ شنواری: شخصیت اور فن	ڈاکٹر قابل خان آفریدی	2007	165/روپے	155/روپے	ختم
47	میاں محمد بخش: شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	2007	165/روپے	155/روپے	ختم
48	ناصر کاظمی: شخصیت اور فن	باصر سلطان کاظمی	2007	200/روپے	190/روپے	ختم
49	ڈاکٹر تنویر عباسی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ادل سومرو	2007	176/روپے	166/روپے	
50	مست توکلی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہ محمد مری	2007	170/روپے	160/روپے	
51	خواجہ غلام فرید: شخصیت اور فن	ڈاکٹر طاہر تونسوی	2007	185/روپے	175/روپے	ختم
52	مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2007	200/روپے	190/روپے	
53	جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ہلال نقوی	2007	210/روپے	200/روپے	ختم
54	ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: شخصیت اور فن	محمد راشد شیخ	2007	165/روپے	155/روپے	
55	ممتاز مفتی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر نجیبہ عارف	2007	190/روپے	180/روپے	ختم
56	شفیق الرحمان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	2007	160/روپے	155/روپے	
57	احمد فراز: شخصیت اور فن	محبوب ظفر	2007	220/روپے	210/روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2016	450/روپے	400/روپے	
58	ڈاکٹر سید عبداللہ: شخصیت اور فن	ڈاکٹر روبینہ شاہین	2007	150/روپے	140/روپے	ختم

59	ضیا جالندھری: شخصیت اور فن	علی محمد فرشی	2008	200/روپے	190/روپے	
60	ممتاز شیریں: شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنظیم الفاروق	2008	215/روپے	210/روپے	
61	پروفیسر فتح محمد ملک: شخصیت اور فن	محمد حمید شاہد	2008	195/روپے	185/روپے	
62	سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن	مبین مرزا	2008	220/روپے	210/روپے	
63	پروفیسر احمد علی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر محمد کامران	2008	190/روپے	180/روپے	
64	کرنل محمد خان: شخصیت اور فن	بریگیڈیر (ر) ایم اسماعیل صدیقی	2008	190/روپے	180/روپے	
65	عابد علی عابد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلیم اختر	2008	225/روپے	215/روپے	
66	سائیں احمد علی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	2008	170/روپے	160/روپے	
67	فارغ بخاری: شخصیت اور فن	طارق ہاشمی	2008	210/روپے	200/روپے	
68	سچل سرمست: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو	2008	150/روپے	140/روپے	ختم
69	شاہ عبداللطیف بھٹائی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر فہمیدہ حسین	2008	170/روپے	160/روپے	ختم
70	دوست محمد کامل مومند: شخصیت اور فن	مصطفیٰ کمال	2008	160/روپے	150/روپے	
71	مسعود مفتی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مقصود حسین	2008	280/روپے	270/روپے	
72	مجید امجد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	2008	170/روپے	160/روپے	
73	بانو قدسیہ: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2008	300/روپے	290/روپے	ختم
74	ن م راشد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	2008	220/روپے	210/روپے	ختم
75	مشتاق احمد یوسفی: شخصیت اور فن	طارق حبیب	2008	260/روپے	250/روپے	ختم
76	رضا ہمدانی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار	2008	240/روپے	230/روپے	
77	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر: شخصیت اور فن	محمد جنید اکرم	2008	210/روپے	200/روپے	
78	جمیل الدین عالی: شخصیت اور فن	نیلم رضا اقبال	2008	210/روپے	200/روپے	
79	زیتون بانو: شخصیت اور فن	یاسمین یوسفزئی	2008	230/روپے	220/روپے	
80	علامہ اقبال: شخصیت اور فن	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	2008	320/روپے	300/روپے	ختم
	ایضاً (سندھی ترجمہ)	مترجم: منظور علی ویسریو	2010	450/روپے	430/روپے	
	ایضاً (پشتو ترجمہ)	مترجم: ام سلمہ شفق	2010	450/روپے	400/روپے	
81	فخر زمان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	2008	150/روپے	140/روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2009	180/روپے	170/روپے	
82	کشور ناہید: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	2008	150/روپے	140/روپے	ختم
83	مخدوم طالب المولیٰ: شخصیت اور فن	سید احمد علی شاہ	2008	190/روپے	180/روپے	ختم
84	عبداللہ حسین: شخصیت اور فن	محمد عاصم بٹ	2008	160/روپے	140/روپے	
	اشاعت دوم	ایضاً	2016	280/روپے	250/روپے	
85	احمد شمیم: شخصیت اور فن	منیر وشیم	2008	220/روپے	210/روپے	
86	ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر: شخصیت اور فن	شبنم شکیل	2008	-	-	ختم
87	احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناہید قاسمی	2009	390/روپے	380/روپے	
88	حبیب جالب: شخصیت اور فن	سعید پرویز	2009	280/روپے	270/روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2010	280/روپے	270/روپے	
89	افتخار عارف: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	2009	275	250/روپے	
90	محمد عثمان ڈیپلائی: شخصیت اور فن	آفاق صدیقی	2009	160/روپے	150/روپے	

91	انیس ناگی شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	2009	250/روپے	230/روپے	ختم
92	علامہ نیاز فتح پوری شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	2009	220/روپے	210/روپے	
93	استاد دامن شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	2009	190/روپے	180/روپے	
94	اقبال ساجد شخصیت اور فن	ڈاکٹر جواز جعفری	2010	240/روپے	235/روپے	
95	خیر النسا جعفری شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنویر جونیجو	2010	230/روپے	220/روپے	
96	عطا الحق قاسمی شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	2010	320/روپے	310/روپے	
97	سید آل رضا شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید محسن نقوی	2010	290/روپے	280/روپے	
98	عرش صدیقی شخصیت اور فن	بیگم نظیر افتخار	2010	220/روپے	210/روپے	
99	حجاب امتیاز علی تاج شخصیت اور فن	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	2010	240/روپے	230/روپے	
100	خدیجہ مستور شخصیت اور فن	تاج بیگم رزقی	2010	210/روپے	200/روپے	
101	ڈاکٹر اسلم انصاری شخصیت اور فن	محمد افتخار شفیع	2010	210/روپے	200/روپے	
102	ڈاکٹر انور سدید شخصیت اور فن	پروفیسر سجاد نقوی	2010	400/روپے	390/روپے	
103	صہبا اختر شخصیت اور فن	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	2010	250/روپے	240/روپے	
104	غلام ثقلین نقوی شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2010	310/روپے	300/روپے	
105	مولوی غلام رسول عالمپوری شخصیت اور فن	صاحبزادہ مسعود احمد	2010	450/روپے	400/روپے	
106	سلیم احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر مختار احمد عزمی	2010	225/روپے	200/روپے	
107	امر جلیل شخصیت اور فن	پروفیسر کے ایس ناگپال	2010	180/روپے	-	ختم
108	منشا یاد شخصیت اور فن	اسلم سراج الدین	2010	350/روپے	340/روپے	
109	ڈاکٹر رشید امجد شخصیت اور فن	ڈاکٹر شفیق انجم	2010	210/روپے	200/روپے	
110	پروفیسر غلام جیلانی اصغر شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2010	260/روپے	250/روپے	
111	افضل پرویز شخصیت اور فن	راجہ شکیل انجم	2010	180/روپے	170/روپے	
112	مجنوں گورکھپوری شخصیت اور فن	جمال نقوی	2010	190/روپے	180/روپے	
113	شیخ سر عبدالقادر شخصیت اور فن	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	2012	260/روپے	250/روپے	
114	شہزاد احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	2012	270/روپے	260/روپے	
115	فرخندہ لودھی شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2012	310/روپے	300/روپے	
116	صوفی شاہ عنایت شہید شخصیت اور فن	منظور علی ویسریو	2012	210/روپے	200/روپے	
117	بلھے شاہ شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	2012	260/روپے	250/روپے	
118	ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	2015	370/روپے	350/روپے	
119	عزیز احمد شخصیت اور فن	ڈاکٹر اعجاز حنیف	2015	240/روپے	220/روپے	
120	مولانا الطاف حسین حالی شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی	2015	330/روپے	320/روپے	

کتب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

میر نواز سولنگی، اسسٹنٹ ڈائریکٹر (سیلز اینڈ ایڈورٹائزمنٹ)
اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد۔
فون: 051-9269711

میں جا چکا ہوں پھر بھی تیری محفلوں میں ہوں

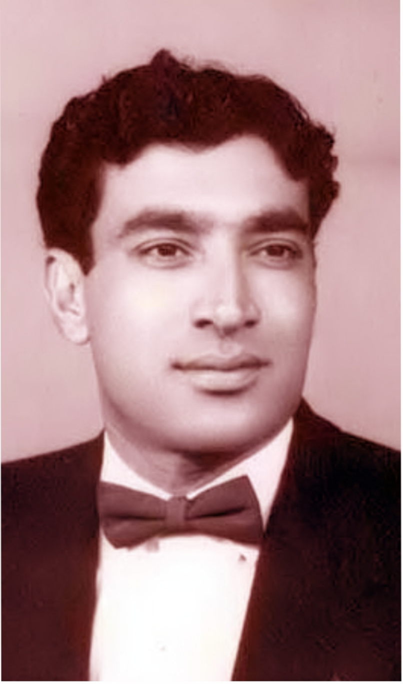

ضیاء احمد ضیاء اور احمد فراز

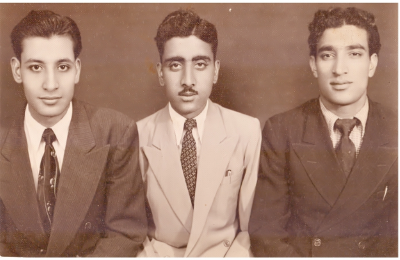

احمد فراز، یوسف رجا چشتی اور محسن احسان

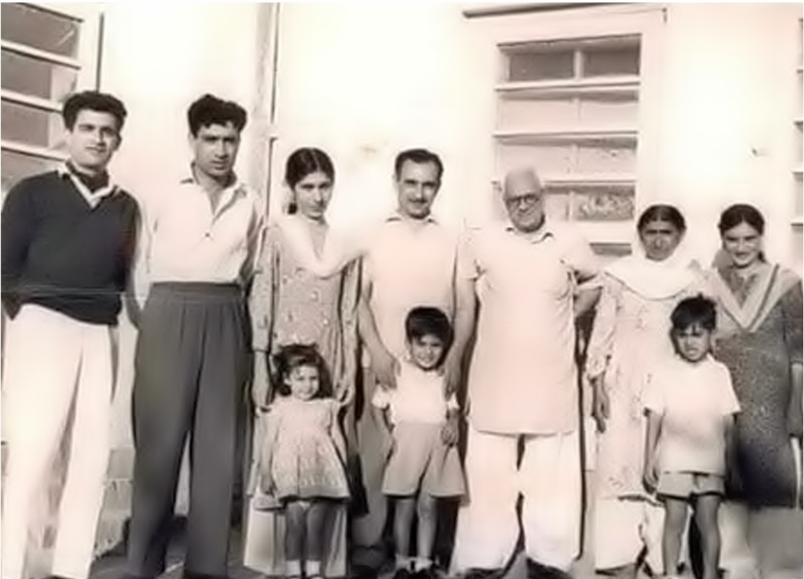

ناہید افتخار بہن، امیر جان والدہ، سعدی، ایم ایس برق والد محمود شاہ بڑے بھائی، شبلی، یاسمین بھتیجی، بیگم فراز، احمد فراز اور مسعود کوثر بھائی

احمد فراز اپنے بیٹوں شبلی فراز اور سعدی فراز کے ہمراہ

احمد فراز، زہرہ نگاہ، فیض احمد فیض، گوپی چند نارنگ شہرت بخاری، جمیلہ بانو اور افتخار عارف

مسعود مفتی، عبداللہ حسین، احمد فراز اور سلطان سکون

خاطر غزنوی، احمد فراز اور انور شعور

احمد فراز، احمد ندیم قاسمی اور اشفاق حسین

احمد فراز اور امریتا پریتم

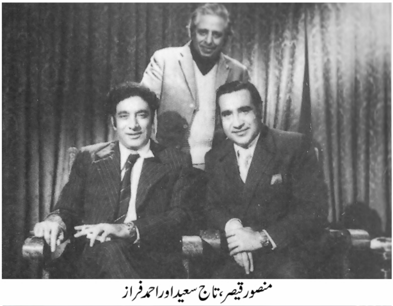

منصور قیصر، تاج سعید اور احمد فراز

احمد فراز اور ن م راشد

احمد فراز اور آغا ناصر

فیض احمد فیض اور احمد فراز

احمد فراز اور کنور مہندر سنگھ بیدی

ڈاکٹر قمر رئیس، احمد فراز، عصمت چغتائی اور علی سردار جعفری

کشور ناہید، احمد فراز، فتح محمد ملک، منشا یاد اور حسن عباس رضا

ڈاکٹر لوڈمیلا، احمد فراز، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور اشفاق حسین

احمد فراز، فیض احمد فیض، عرفانہ عزیز اور اشفاق حسین

افتخار نسیم احمد فراز اور ڈاکٹر شیرازی (امریکہ میں ہسپتال داخل ہونے سے پہلے لی گئی آخری تصویر)

ثمینہ راجہ، فتح محمد ملک، منشا یاد، حلیم قریشی، اسلم راؤ اور احمد فراز

سلیم جعفری، احمد فراز، پروین شاکر، خمار بارہ بنکوی اور دیگر

کشمیری نژاد بھارتی فنکارہ پشپا ڈوگرہ فراز صاحب کی غزل "رنجش ہی سہی" کو رقص کی صورت میں پیش کرتے ہوئے، احمد فراز بھی موجود ہیں

محبوب ظفر، فتح محمد ملک، احمد فراز اور ثمینہ راجہ

احمد فراز بوسٹن (امریکہ) میں ڈاکٹر صبیحہ صبا، خالد عرفان اور اپنے دیگر مداحین کے ساتھ

ڈاکٹر احسان اکبر، منہاج برنا، محبوب ظفر، احمد فراز، منظر نقوی، الماس شبی، فرح دیبا اور نصرت مسعود

جون ایلیا، سرشار صدیقی، دلیپ کمار، احمد فراز، سلیم جعفری اور دیگر

سارہ بانو، میڈم نور جہاں اور احمد فراز

اے ہم سخنو کچھ تو کہو عہد ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

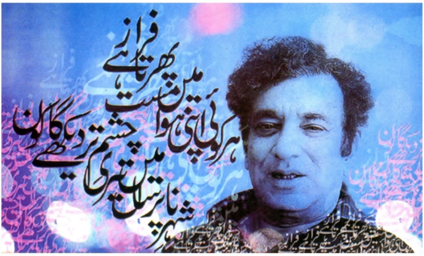
ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فراز
شہر ناپرساں میں تیری چشم تر دیکھے گا کون

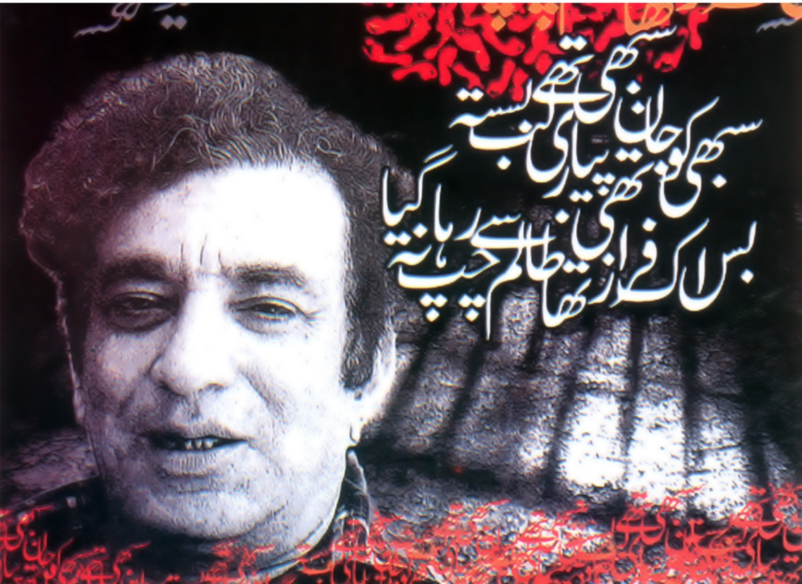
سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

محبوب ظفر 4 جنوری 1956ء کو جیکب آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا بنیادی تعلق تلہ گنگ ضلع چکوال سے ہے تاہم انہوں نے تمام تر تعلیم سندھ میں حاصل کی جہاں اُن کے والد بحیثیت پولیس آفیسر سندھ کے مختلف شہروں کشمور، شکار پور، سکھر، لاڑکانہ اور جیکب آباد تعینات رہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی ان ہی شہروں سے حاصل کی۔ میٹرک جیکب آباد سے کیا اور پھر ایف اے، بی اے اور ایم اے (اُردو) کراچی سے کیا۔ اس کے بعد پاکستان نیوی میں ملازمت اختیار کی جہاں مختلف ممالک کے علاوہ سفارت خانہ پاکستان دہلی اور کچھ عرصہ لندن میں بھی قیام کا موقع میسر آیا جس سے اُن کے ادبی اور شعری سفر کو فروغ حاصل ہوا۔ دہلی میں ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں انہیں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ بھی ملا۔ پنجابی، اردو کے علاوہ آپ کو سندھی اور ہندی زبان پر بھی عبور حاصل ہے۔ آپ نے سندھ کے عظیم شاعر شاہ عبدالطیف بھٹائی پر لکھے گئے انگریزی اور سندھی مضامین اور جدید سندھی اور ہندی افسانہ اور شاعری کے اُردو تراجم بھی کیے جو مختلف ادبی پرچوں میں چھپتے رہے ہیں۔ آپ کی تخلیقات پاکستان کے تمام نمائندہ اور معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ آپ پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک کے مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں اور بے شمار ادبی ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پندرہ برس تک ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے ادبی پروگرام ''افکار'' کے مدیر و میزبان رہے اور پاکستان ٹیلی ویژن سمیت متعدد نجی ٹی وی چینلز کے مشاعروں کی بھی میزبانی کرتے رہے ہیں۔ ادبی و ثقافتی تنظیم ''زاویہ'' کے صدر کی حیثیت سے اسلام آباد راولپنڈی میں کلچر، ثقافت اور کتاب کے فروغ کے لیے ان کی کاوشیں لائقِ تحسین ہیں۔ محبوب ظفر کی شاعری زندگی کے رنگوں اور سچے جذبوں کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے۔ آپ کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جب کہ چار زیرِ اشاعت ہیں۔

ISBN-978-969-472-290-0